اللہ اکبر

انتخابِ مضامینِ جوہر

(نقیبِ جامعہ)

مرتبہ

مجلسِ جوہر جامعہ ملیہ علی گڑھ

(مطبع جامعہ ملیہ علیگڈھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتخاب مضامین

جوہر

جسکو

طلبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ اول ہفتہ وار اخبار کی حیثیت سے اور بعد کو ماہوار
رسالہ کی صورت میں قلمی لکھ کر شائع کرتے رہے اور آیندہ مجلس تعلیمی کے فیصلہ کے
مطابق وہ طلبہ کے زیر اہتمام "جامعہ" کے نام سے ماہوار شائع ہوا کرے گا

در مطبع جامعہ ملیۃ اسلامیہ علیگڈھ طبع شد

(زیر اہتمام شعبہ تصنیف و تالیف)

نور الرحمن ناشر

انتساب

ان اوراق پریشاں کو مولٰنا محمد علی صاحب مدظلہ
کے نام نامی سے معنون کیا جاتا ہی

ان کے قدموں سے بنا ہی یہ عرش
ورنہ دل کی کوئی بنیاد نہیں

(الف)

فہرست مضامین

حصہ نظم

نمبر	نام مضمون	نام مصنف	صفحہ

غزلیات

التماس

طالباے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علمی و عملی کارناموں میں ایک دلچسپ و مفید چیز اخبار ”جوہر“ بھی تھا، جو ہفتہ وار قلمی لکھا جاتا تھا۔ اس کی اعلی مضامین اور قابل قدر شذرات خصوصیت کی ساتھہ طلباء، اساتذہ، اور جامعہ کی ارکان انتظامی میں پسندیدگی کی نظر سی دیکھی گئی تھی یہہ مجموعہ اوراق اسی کی یک سالہ زندگی کا جوہر ہی جو اپنی اندر گونا گون دل چسپیاں رکھتا ہی *

جامعہ کی ارکان مجالس تعلیمی نی طلباء کی یہہ قابل قدر علمی سرگرمیاں دیکھہ کر فیصلہ فرمایا کہ آیندہ سال کی آغاز سی ایک ماہانہ رسالہ ”جامعہ“ کی نام سی جاری کیا جاے جس کی تمام تر ذمہ داریاں حتی کہ ادارت اشاعة، طباعة، غرض کل کام طلبہ ہی کی ہاتہوں میں ہوں۔ اور جامعہ کی شعبہ تصنیف و تالیف کی نگرانی رہی۔ انشاء اللہ ”جامعہ“ جنوری آیندہ سی عالم وجود میں آجائیگا اور اپنی ظاہری و باطنی محاسن کی لحاظ سی قابل دید ہوگا۔ قوم کی تمام دردمند و علم دوست اصحاب سی درخواست ہی کہ ضرور جامعہ کی خریداری فرما کر

طلباے جامعہ کی عملاً حوصلہ افزائي فرمائیں جسکی یقیناً وہ مستحق ھیں *

«جامعہ» کي سالانہ قیمت چار روپیہ ہوگی اور حجم تقریباً اڑتالیس صفحات ہوگا جناب پیشگي قیمت ادا فرما کر رسید حاصل کراین تا کہ ابھي سی فہرست خریداران میں نام درج ہوجاسے اور «جامعہ» کي اشرو اشاعت میں مزید سہولت و تقویت حاصل ہو والسلام

خاکسار

نورالرحمن

دفتر شعبۂ تصنیف و تالیف
جامعہ ملیہ — علیگڈہ *

دفتر رسالہ جامعہ علیگڈہ

رسید نمبر ———

جناب صاحب سی مبلغ چار روپیہ قیمت پیشگي رسالہ «جامعہ» بابت سنہ ۱۹۲۳ع وصول پاسے *

دسمبر سنہ ۲۲ ع دستخط ———

آزادیٔ امریکہ

آزادی قدرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے جس قوم میں آزادی کی سچی محبت ہوتی ہے، وہ اس کی راہ میں دنیا کے بڑے بڑے مصائب و خطرات کا خوشی سے استقبال کرتی ہے ؎

در رہِ منزلِ جاناں کہ خطرہاست بسے   شرطِ اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

امریکہ سے مراد وہ حصۂ بر اعظم ہے جو اب ریاستہائے متحدہ امریکہ کے نام سے موسوم ہے۔ سلطنت برطانیہ سے اس کی آزادی حاصل کرنے سے قبل یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ ملک اس سلطنت کے قبضہ میں کیونکر آیا؟

(۱)

امریکہ برطانیہ کے اقتدار میں کیونکر آیا؟

پندرھویں صدی کے آخر میں جب امریکہ دریافت ہوا، اس وقت ممالک یورپ سے کچھ باشندے ترک وطن کر کے امریکہ چلے گئے اور وہاں کی زرخیز زمینوں اور بیش قیمت معادن سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے آباد ہونے لگے۔ یہ ہجرت بادی النظر میں کسی قانون یا خاص نظم و تربیت کے ماتحت نہ تھی۔ تھوڑے دن بھی ان مہاجرین نے آزادی اور چین کی زندگی بسر نہ کی تھی کہ یورپ کی حکومتوں نے اس سرزمین کو اپنی حرص و طمع کا جولانگاہ بنالیا اور وہاں کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے تہذیب و تمدن سے بالکل بیگانہ تھے اور اپنے کو ہندو کہتے تھے۔

سولھویں [۱۶] صدی کے آغاز میں انگلستان کے بادشاہ جیمز اول نے اپنی رعایا میں سے ایک جماعت کو تجارتی کمپنیاں قائم کرنے کا حکم دیا۔ اول اول ان کمپنیوں کو آب ہوا کی ناموافقت، ملک کی اجنبیت نیز دوسرے اسباب کی بنا پر بڑی بڑی اذیتیں اُٹھانی پڑیں۔ لیکن اُنھوں نے اپنا قدم ڈگمگانے نہ دیا۔ ان کو دیکھ کر اسپین اور ہالینڈ کے لوگوں نے بھی اپنی اپنی کمپنیاں قائم کیں، لیکن ان سب میں انگریز سب سے بہتر حصہ ملک پر قابض تھے اور روز بروز اپنا دائرۂ حکومت وسیع کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ ہالینڈ والوں سے ۱۶۶۴ء میں ایک سخت جنگ واقع ہوئی جس میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور ہالینڈ کے تمام مقبوضات ان کے ہات آ گئے۔

امریکہ میں جو انگریز اس وقت زمینوں کے مالک تھے ان کی مختلف حیثیتیں تھیں بعض بطور خود قابض تھے، بعض شاہی اجازت سے اور بعضوں کو حکومت نے وقف کر دیا تھا۔ زمین وغیرہ کے معاملات میں مہاجرین اور عمال حکومت کے درمیان تنازع و اختلاف پیدا ہونے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاجرین کی تمام زمینوں کو حکومت نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور ایک مستقل نو آبادی قائم کر لی۔ اس وقت امریکہ میں یہاں کے اصلی باشندے ہنود اور یورپ کی مختلف قومیں آباد تھیں لیکن ان سب میں غلبہ حکومت کی زبان کو حاصل ہوا اور انگریزی رواج پا گئی۔

(۲)
امریکہ کی بیداری کے اسباب

ایک زمانہ میں انگریزوں کا اعتقاد تھا کہ کوئی نباتات یا ذی روح اپنے ملک سے منتقل ہو کر دوسرے ملک میں جائے تو اس کی وہ قدر باقی نہیں رہتی۔ یہی سبب تھا کہ وہ اپنے انگریز بھائیوں کو جو امریکہ میں سکونت پذیر تھے، نفرت و حقارت کی نظر سے

دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان امریکی انگریزوں میں باہمی اتحاد و یگانگت کی روح ترقی کرنے لگی۔ اُنھوں نے مغربی تمدن کو اپنے ہاں رواج دیا لیکن یہ کوئی تقلید کورانہ کی بنا پر نہ تھا۔ تعلیم کی طرف توجہ کی تو اپنے ہاں سے انگلستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تحصیل علوم کیلئے اشخاص بھیجے۔ جنھوں نے واپس آکر اپنے ملک میں یونیورسٹیاں قائم کیں اور ۱۷۶۰ء میں چھ عظیم الشان یونیوسٹیاں قائم ہوگئیں۔

یہیں تک نہیں بلکہ صنعت تجارت کی طرف رُخ کیا تو قلیل عرصہ میں چونکہ معادن اور خام اشیا بافراط تھیں، اس قابل ہو گئے کہ دوسرے ممالک سے لین دین کر سکیں لیکن انگلستان نے متعدد قوانین کے ذریعہ ان کے ان تجارتی تعلقات کو توڑنا چاہا جن سے ان کی تجارت کو سخت صدمہ پہنچا۔ ہر چند امریکیوں نے اس پر احتجاج کی لیکن نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہی۔ اُٹھارہویں صدی کے وسط میں جب عنان انگلستان ولیم پیٹ کے ہات میں آئی تو اس نے امریکہ کے ساتھ بہت سی مراعات کیں جن سے ان کی تجارت کو بہت کچھ فروغ ہوا۔

اس موقع کو غنیمت سمجھکر امریکیوں نے چپکے چپکے اپنے کو ہر طرح سے انگریزوں کے مقابل تیار کرنا شروع کیا۔ انگریزی مظالم وہ بھولے نہ تھے، آزادی کے خیال سے وہ کچھ غافل نہ تھے۔ اب جو چیز ان کو مانع تھی، وہ فوجی طاقت کی کمی تھی۔

یہاں پر یہ ذکر دینا ازبس ضروری ہی کہ اس وقت امریکہ میں انگریزوں کے ایک بہت بڑے حریف فرانسیسی تھے۔ تیرہویں صدی کے آخر میں ان دونوں حکومتوں میں چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی اور ایک زمین کے معاملہ میں جسے انگریزوں نے دبا لیا تھا ایک عظیم الشان جنگ برپا ہوئی جو تاریخ میں ہفت سالہ جنگ، کے نام سے موسوم ہی۔ اس جنگ میں امریکہ والوں نے انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں کا ساتھ دیا تھا اس جنگ کا خاتمہ اگرچہ صلح پر ہوا لیکن انگریزی حکومت کی فوجی طاقت کو

بہت بڑا صدمہ پہنچا اور اس طرح سے امریکہ کے مقابلہ میں اس کا پلہ جو بھاری پڑتا تھا وہ فرق اب جاتا رہا۔

(۳)

جارج سوم بادشاہ انگلستان اور ان کی سیاست

جس وقت یہ جنگ عظیم ختم ہوئی، اس وقت تخت انگلستان پر جارج سوم حکمران تھا، جارج سوم اگرچہ کوتاہ فہم اور ضعیف الرائے تھا، سیاسیات سے بالکل بیگانہ تھا، لیکن باینہمہ حوصلہ یہ تھا کہ پارلیمنٹ سے آزاد ہو کر خود مستقل حکومت کرے۔ یہ ارادہ اگرچہ اس کا نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس لیے کہ وہ قوم و وطن کی اسی طریقہ پر خدمت کرنا چاہتا تھا، لیکن وہ لائق اور باکمال ارباب سیاست سے کام لینا نہ جانتا تھا، اس کمی نے اس کو اور کمزور بنا دیا، اس لیے کہ ایک وہ بادشاہ جو خود مختار ہونا چاہے، اور تمام امور سلطنت کو بجبر اپنے ہات میں لینا چاہے، وہ اگرچہ کتنا ہی عقلمند اور ذی فہم کیوں نہو، مگر صدہا لغزشیں کرے گا، اور بعض وقت تخت سے اتر جانے تک کا خطرہ ہوگا، پھر اس بادشاہ کا کیا حشر ہوگا۔ جو ضعیف الرائے اور کم عقل ہو، مزید خوبی یہ تھی کہ اپنے معاصرین مدبرین سیاست سے ملنے میں سخت عار رکھتا، خصوصاً ولیم پیٹ سے جو اس وقت بہت ہی نامور و مشہور سیاسی شخص تھا، جارج نے جس وقت سے زمام حکومت اپنے ہات میں لی، اپنی ہی رائے اور سمجھ کے مطابق سلطنت کو چلانا چاہا، اس وقت انگلستان میں سلطنت کے متعلق دو بڑی پارٹیاں پیدا ہو گئی تھیں ایک بادشاہ کی حمایت کرتی تھی، کہ وزرا اور ارباب حکومت وغیرہ کا انتخاب اس کے ہات میں ہونا چاہیے، اور ایک پارلیمنٹ کا ساتھ دیتی تھی، کہ یہ تمام حقوق اسی کے ہیں، اس وقت شاہی طرفداروں کا غلبہ تھا، بادشاہ موصوف کے استبداد و سیاست نے اور اس جماعت کو غالب کر دیا تھا، اس وقت رشوت ستانی کلیۃً عام

تھا، کہ لوگ سیم و زر کے پیچھے دوڑتے تھے، جس طرف اس کی بارش ہوتی اُسی طرف لوگ زیادہ جھک جاتے، کبھی بادشاہ کی طرف اور کبھی پارلیمنٹ کی طرف، اس جماعت کا سب سے بڑا لیڈر ولیم پٹ تھا۔

اتفاق یہ ہے کہ جارج کے شروع عہد ہی سے وہ ہفت سالہ جنگ بھی جاری تھی جو امریکہ میں انگریز اور فرانسیسیوں کے درمیان چھڑی تھی، جارج نے جلد سے جلد اس جنگ سے فارغ ہونا چاہا، تاکہ پھر امن و سکون سے اپنے مقاصد کی تکمیل کا موقع ملے، یہ آرزو پوری ہوئی مگر کب، جب فوجیں تھک چکی تھیں، خزانہ خالی ہو چکا تھا قرضہ کے بار گراں نے سلطنت کو کوزہ پشت بنا دیا تھا، جارج نے قوانین قدرت سے اغماض کیا، اور اس حقیقت کو نقاب پوش کر کے کہ ایک طاقت کے روبرو بھی اس سے زبردست طاقت ہوتی ہے، امریکہ پر سخت گیریاں شروع کر دیں، وہاں کی رعایا پر بڑے بڑے ٹیکس اور محصول مقرر کیے، ایک زبردست ٹکس اسٹامپ کا جاری کیا گیا، یعنی عدالت کی عرضیوں اور دستاویزوں پر قیمتی ٹکٹ لگانے پڑتے تھے، جیسا کہ ہندوستان میں بھی ہو رہا ہے، یہ عجیب ٹیکس انگلستان کی تاریخ میں پہلا ٹکس تھا۔ امریکہ میں اس جدید ٹیکس سے بڑی خلفشاری اور بےچینی پھیل گئی۔ مقررین اور سیاسی اشخاص نے ان مظالم کے خلاف زبردست تقریریں کرنی شروع کیں بادشاہ جارج کو علانیہ بُرا بھلا کہتے تھے، اور اس کے بیجا ظلم و تعدی سے نجات حاصل کرنے کے لیے عوام کو ترغیب دیتے تھے، خواہ تلوار ہی کیوں نہ اُٹھانی پڑے۔ خفیہ اور ظاہر دونوں میں ایسی جماعتیں ملک میں قائم ہو گئیں، جو دن رات اپنے جلسہ کر کے عوام کو حکومت کے خلاف برانگیختہ کرتی تھیں ایک بہت ہی زبردست انجمن "انجمن ابنائے حریت" کے نام سے قائم ہوئی، اس کے ممبران نے وہ عجیب غریب کارنامے انجام دیے، کہ قلم ان کے بیان سے قاصر ہے، ملک و وطن کی راہ میں

بیدریغ اپنی جانیں قربان کیں، زبان سے ہمیشہ حق ہی کی صدا بلند ہوتی تھی، خواہ
ان کے سر تن سے جدا کیوں نہ کردیے جائیں، حکومت نے ٹکٹ بیچنے کے لیے ایک
جماعت مقرر کی تھی، ان میں سے کسی کو اگر کوئی امریکن دیکھ پاتا تھا، تو خوب سزا دیتا
تھا، اور ہر ممکن تذلیل و توہین سے پیش آتا تھا، آخر ۱۷۶۵ء میں ایک بڑی کانفرنس
منعقد ہوئی۔ اس میں تمام صوبجات کے بڑے بڑے لوگ شریک ہوئے، اور سب نے
متفقہ یہ پاس کیا کہ سلطنت انگلستان کو ہرگز یہ حق نہیں کہ وہ اس قسم کا ٹیکس
امریکہ سے وصول کرے، اور اسی مضمون کی ایک عرضداشت بادشاہ اور پارلیمنٹ
کے سامنے پیش کی، حکومت نے اسٹامپ ٹیکس کو اسی سال پہلی نومبر میں مقرر
کیا تھا، جس روز یہ نیا محصول پاس ہوا ہے اُسی روز ملک کے تمام حصوں میں مشرق
سے مغرب تک ایک مکمل ہڑتال منائی گئی، جس روز پہلی نومبر کا آفتاب افق
امریکہ سے طلوع ہو رہا تھا، تمام ملک میں ایک خاموشی و سکون طاری تھا، تمام
کارخانے اور چھوٹی بڑی دُکانیں بند تھیں، ہر شہر کے گلی کوچوں میں رنج و افسوس کے
نشانات لگے تھے، شہر کیا تھے اچھے خاصے ماتم کدے تھے، بعض امریکیوں نے
موقع پاکر بعض انگریزوں کو اس روز قتل و غارت بھی کیا تاجروں نے یہ عہد کر لیا
کہ اب وہ انگلستان کے ساتھ کسی قسم کی تجارت اور لین دین نہ کریں گے،
یہاں تک کہ امریکہ میں ایک چیز بھی انگلستان کی نہیں خریدی جاتی تھی، اِن
وحشتناک خبروں نے بجلی کی طرح انگریزوں پر اثر کیا، بالخصوص تاجروں پر۔
اس جماعت نے فوراً اپنی آواز کو امریکہ کی آواز کے ساتھ ملایا، اور حکومت سے
اس محصول کے بند کرنے کا سخت مطالبہ کیا، چنانچہ بڑی بحث و مباحثہ کے بعد
یہ محصول بند کر دیا گیا، اس کامیابی میں بڑا حصہ مسٹر پٹ کا تھا، یہ شخص نہایت ہی
آزاد خیال اور انصاف پسند تھا، دارالعوام میں ایک موقع پر اس شخص کا ایک

فقرہ قابل ذکر ہی، کہتا ہی "محترم حضرات! میری رائے میں حکومت کو ہرگز یہ حق نہیں ہی، کہ وہ نوآبادیات پر ٹیکس لگائے۔ امریکہ ایک غیور ملک ہی وہ وقت قریب ہی جب امریکہ اپنی متحدہ قومیت کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہو"

امریکیوں نے اپنی ماں انگلستان کے جور وستم اس صبر و تحمل سے برداشت کیے، جس طرح سے ایک مطیع و فرمانبردار بیٹا ظالم والدین کی سختیاں برداشت کرتا ہی، بار بار شفقت کے لیے التجائیں اور منتیں کیں، نیک برتاؤ کے لیے ہات پھیلایا اس کی سیادت کو اپنا فخر سمجھا، محصولات کی زیادتی پر بھی کبھی اظہار ناراضگی نہیں کیا، حقیقت یہ ہی کہ امریکہ کی اطاعت شعاریوں سے گورنمنٹ نے غلط فائدہ اُٹھایا اس کے معمولی مطالبات کو بے پروائی سے ہمیشہ ٹھکرادیا، امریکہ نے بارہا اس کے لیے اصرار کیا کہ ان کا صرف ایک نمائندہ پارلیمنٹ میں ان کی مرضی کے مطابق لے لیا جائے، اور اس کے حقوق انگریزوں کے مساوی رکھے جائیں، دوسرے یہ کہ امریکہ کو گورنمنٹ کے ماتحت اسکاٹ لینڈ کی طرح ایک صوبہ سمجھا جائے، ان کے حقوق وہی ہوں جو اسکاٹ لینڈ کے، نہ یہ کہ صرف پارلیمنٹ کے ہات میں کٹھ پتلی بنا رہے، اگر یہ کچھ نہیں تو امریکہ پھر خود اپنی ایک گورنمنٹ قائم کرے گا، اور ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق قواعد و قوانین کی ترتیب و تنسیخ کرے گا، شاہی طرفداروں پر ان عرضداشتوں اور مظاہروں کا کوئی اثر نہیں ہوا، ہاں عناد و مخالفت نے اور قدم بڑھایا، ان لوگوں نے صدہا تدابیر امریکہ کو پامال کرنے کے لیے اختیار کیں کوئی قید و بند ایسی نہ رہی، جو غریب امریکہ پر نہ عائد کی گئی ہو، تمام معزز عہدے ان سے چھین لیے گئے، معمولی جگہ بھی ان کو بلا شاہی اجازت کے نہیں دی جاتی تھی، ملک میں انگریزی فوجیں کثرت سے رکھی جانے لگیں، اور ان کے اخراجات تمام امریکہ کے خزانہ سے ادا ہوتے تھے، ان کو

حکومت کی طرف سے اس قدر آزادی حاصل تھی، کہ جس امریکی کو چاہیں، معمولی خطا پر ذلیل و خوار کر دیں، غرض کوئی طریقہ امریکہ کے احساس جمہوریت کو مٹانے کا اُٹھا نہ رکھا گیا، تجارت پر اور طرح طرح کی حقارت آمیز سختیاں عائد کی گئیں، مال کی آمد و رفت سے بیشتر کشتیوں کی تفتیش کی جاتی تھی، کہ ان کے اندر انگریزوں کے علاوہ تو کسی کا سامان نہیں بھیجا جا رہا ہے، مگر اس تفتیش کا اصل مقصد قتل و غارت اور سامان تجارت کو لوٹنا ہوتا تھا، حتیٰ کہ اب امریکہ کا یہ حال ہو گیا کہ ان کے جان و مال محفوظ نہ رہے۔

ملک میں اس خلفشاری اور بےچینی کا ذمہ دار صرف انگریزوں کا وحشیانہ برتاؤ تھا، جب امریکہ کے لیے نجات کی کوئی راہ باقی نہ رہی، اس وقت اس نے مجبوراً مدافعت کے لیے ہاتھ اُٹھایا، مصائب کی کثرت نے تمام کو متحد کر دیا، تمام صوبجات باوجود اختلاف عادات و معاشرت کے ایک ہی لڑی میں منسلک ہو گئے، حقوق کی محافظت کے لیے تمام ملک کی ایک مشترکہ کانفرنس قائم ہوئی مکمل اتحاد کی طرف امریکہ کا یہ پہلا قدم تھا، انگریز نائبین حکومت بجائے اس کے کہ حکومت کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرتے، اور اصلی خطرات سے واقف کرتے، خود انھوں نے حکومت کے لیے زہر بونا شروع کیا، امریکہ پر وہ مظالم توڑے، کہ ان کے تصور سے دل میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے، جو لوگ ملک میں اتحاد و اتفاق کو فروغ دیتے، ان پر یہ الزام لگایا جاتا، کہ حکومت کے خلاف سازش کر رہے ہیں اسٹامپ کا وہ سخت محصول جو کتنی دشواریوں کے بعد موقوف ہوا تھا، پھر جاری ہو گیا اس مرتبہ اس کی صورت اور بھی خوفناک تھی، کوئی کاغذ معمولی سے معمولی اگر گورنمنٹ کو لکھا جائے تو اس پر قیمتی ٹکٹ لگانے پڑتے تھے، اگر اس کے خلاف ہو تو اس کاغذ پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی، یہ سب آمدنی فوج کے بڑھانے میں صرف کی جاتی تھی، اس کے

علاوہ امریکہ کے لیے یہ حکم تھا، کہ وہ فوج کے خورونوش اور بالائی ضروریات زبردستی بہم پہونچائے۔

انگلستان اِن نادرشاہی احکامات کو برابر جاری کر رہا تھا، اس کو کبھی اس کا وہم تک نہ ہوتا تھا، کہ امریکہ ان کے خلاف معمولی جنبش بھی کر سکتا ہے، لیکن بالآخر انجام میں محسوس کرنا پڑا، اس لیے کہ امریکہ کا پیمانہ صبر اب لبریز ہو چکا تھا ضبط و تحمل کی عنان اس کے ہات سے چھٹ چکی تھی، تمام ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک آگ بھڑک اُٹھی، ملک کے سچے خادموں اور لائق رہنماؤں نے تمام ملک کو زبردست مقاومت کے لیے آمادہ کیا، انگریزوں کو تمام معزز عہدوں سے زبردستی اُتارنا شروع کیا، حکومت اور پارلیمنٹ کے تمام احکامات کو نافرمانی کی ٹھوکر لگادی، اخبارات کا لب ولہجہ قوم و ملک کی حمایت میں نہایت سخت ہو گیا، اب انگریز یک بیک خواب غفلت سے چونکے، اور گرد و پیش اِن خطرات کو دیکھا جن میں اس وقت حکومت گرفتار تھی، لیکن اب ان کی بیداری سے کیا فائدہ تھا، جبکہ قدرت کا اٹل قانون مسلط ہو چکا تھا، امریکہ نے اس وقت تمام وہ تیاریاں کر لی تھیں جو ان کو اس آزادی کی جنگ کے لیے ضروری تھیں باقاعدہ حکومت کے خلاف اب جنگ شروع ہو گئی، اس وقت امریکہ کی کمان اس نامور فدائی وطن کے ہات میں تھی، جس کا نام بعد میں امریکہ کی تاریخ حریت میں سنہرے حروف سے لکھا گیا، جس کے کارنامے امریکہ میں آج بچے بچے کی زبان پر ہیں، اور جس کے حالات و سوانح آج مُردہ قوموں میں آزادی کی روح پھونکنے کے لیے صحیح دستورالعمل ہیں، یہ ذات والاصفات جارج واشنگٹن کی ہے، جس کے ہاتوں خدا نے امریکہ کو آزادی نصیب کی، مختلف معرکوں میں کامیاب ہونے کے بعد ۴ جولائی ۱۷۷۶ء میں کانگریس امریکہ نے عام اعلان آزادی کر دیا۔

اعلان آزادی کے بعد بہت سخت لڑائیاں انگلستان و امریکہ کے درمیان پیش آئیں، کبھی ایک فریق کامیاب ہوتا تھا اور کبھی دوسرا، طوالت کے خیال سے ان واقعات کی تفصیل نہیں کی جاتی ہے۔ آخری انجام یہی ہوا، کہ وہ پرجوش جماعت جو صرف آزادی کے لیے اپنا خون بہا رہی تھی، کامیاب و بامراد ہوئی انگلستان نے عاجز آکر ۱۷۸۳ء میں معاہدہ ورسیلز کے ذریعے سے امریکہ کی آزادی کو باقاعدہ تسلیم کرلیا، خدا ہر مظلوم قوم کو اسی طرح ظالم کے پنجۂ استبداد سے نجات دے۔ (آمین)
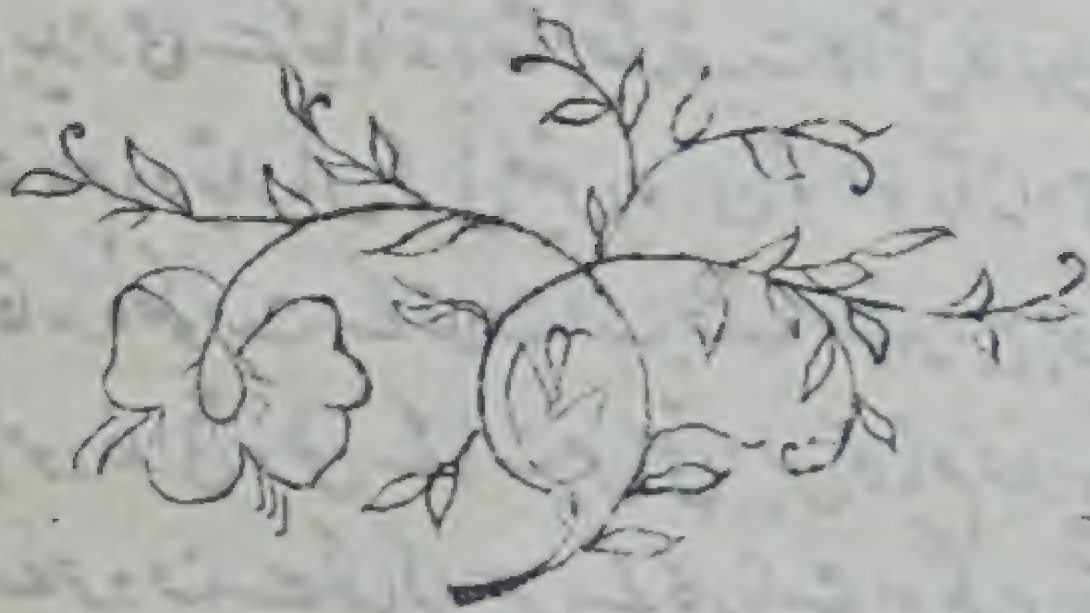
ڈپٹی صاحب کے گھر میں

ع یہ باتیں کسی دل پہ گزری ہوئی ہیں (جوہر)

(۱)

"نوج ایسا بھی کوئی ہو۔ دُنیا جہاں کے ڈپٹی ہوتے ہیں یا یہی کوئی انوکھے ڈپٹی ہیں نہ جان کا خیال نہ عزت کا پاس۔ خیر خواہی کے پیچھے مرے پھرتے ہیں۔ اب کلکٹر ہی کو دیکھو۔ اپنی جان چُرا کر بھاگ گیا اور ان کے سر سارا وبال تھوپ گیا۔ اور یہ اتنا بھی اپنے پھوٹے منہ سے نہ بولے کہ یہ کام تو سرکار ہی کو زیبا ہے۔ سمجھاتے سمجھاتے میں تو کل سے ہار گئی کہ ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اب بھی جا کر کلکٹر سے کہدو۔ نہ ہو کوئی بہانہ ہی کر دو۔ لیکن وہ! توبہ۔ توبہ ان کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ جب زیادہ کہو تو منٹھ مردی سے جواب دیدیتے ہیں۔ "بس چُپ رہو۔ نہیں کوئی کھا جائیگا۔"

اللہ جانے میری تو زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ ہائے امّاں باوا نے بھی ایسے کے پلّے باندھا ہے کہ جی سے بُرا لگتا ہے۔ خود تو مزے سے قبر میں پاؤں پھیلائے سوتے ہیں اور مجھے سُلگنے کو چھوڑ گئے۔ اچھا خیر۔ وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں تو مجھے بھی آج ضد آگئی ہے۔ سو ایسی رہو جو میں آج کھانا پکاؤں۔ یا وہ مجھے ہی کھائیں گے یا پھر کھانا ہی کھائیں گے۔"

گنگا کے کنارے والے بنگلے میں جس کے ایک طرف چار دیواری کھنچی ہوئی ہے باہر کے دالان میں ایک چارپائی پر ایک ادھیڑ عورت۔ گورا گورا رنگ سیاہ پھنسا ہوا پائجامہ سفید کرتا۔ پیازی دوپٹہ۔ آنچل منہ پر لیئے سسکیاں بھر رہی ہے اور ایک مجنونانہ انداز سے یہ الفاظ کہہ رہی ہے کہ اتنے میں ایک خوبصورت سا لڑکا کوئی آٹھ

برس کی عمر ہو گی منھ بسورتا " اماں بھوک لگی ہے" کہتا ہوا آ کر لپٹ گیا۔ اس نے فوراً اُلٹے ہاتھ سے ایک دھکا دیا اور کہنے لگی "بھوک لگی ہے تو جا اپنے ابا کی بوٹیاں کھالے اُنھیں کو اپنی جان اجیرن ہے" لڑکا بیچارا سہم کر دور ہٹ گیا اور چپکے چپکے رونے لگا یہ دیکھ کر مامتا نے زور کیا اور اس نے لڑکے کو کلیجے سے لگا لیا پیار کیا اور کہنے لگی "بیٹا تجھے کچھ معلوم بھی ہے کہ میں کل سے برابر کیوں رو رہی ہوں"

بیٹا:۔ اماں میں نے تم سے ڈر کے مارے نہیں پوچھا۔

ماں:۔ تم جو اُس روز کچہری گئے تھے نا پھر آ کر کہا تھا کہ آج تو ابا کی کچہری کے سامنے بڑی بھیڑ تھی۔ تو بیٹا اُس روز کوئی فقیر گرفتار ہو آیا تھا۔ سنتے ہیں کہ وہ گاندھی جی کا چیلہ ہے۔ انھی کی طرح نگر نگر کہتا پھرتا ہے کہ سب ہندو مسلمان مل کے رہو۔ شراب مت پیو۔ گاڑھے کے کپڑے پہنو اور پنچایت میں فیصلہ کراؤ۔ غرضیکہ سرکار سے کھٹ پٹ کر لو۔ اس نے ترکوں سے بے انصافی کی ہے اور پنجاب میں ظلم کیے ہیں ہاں تو اِس بیچارے کو یہ کلکٹر پکڑ لایا ہے اور اپنا پیچھا چھڑا کر اس کا مقدمہ تمھارے ابا پہ ڈال دیا ہے۔ اس دن اس ہی کی پیشی تھی۔ اب کل پھر ہو گی۔ سنتی ہوں سارا شہر اس کا شیدا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اسے جیل ہو گی تو سب جیل خانے جائیں گے اور اپنی اور دو چار قید کرنے والے کی جان ایک کر دیں گے۔ ماما عظمت ابھی سودا لینے گئی تھی وہ کہتی تھی کہ باہر سے آدمی پہ آدمی چلے آ رہے ہیں۔ ابھی پانچ ہزار آدمی باہر سے آئے ہیں۔ ان کے منصوبے کچھ اور ہی سُننے جاتے ہیں۔ میری جان یہ سُن سُنکر خشک ہوئی جاتی ہے اور اکی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

بیٹا:۔ اماں تو میں ایک ترکیب بتاؤں۔

ماں:۔ بتلاؤ۔

بیٹا۔ کل ابا کو کچہری نہ جانے دو سب جھے لپیٹ جائیں گے بس کیسے جائینگے

ماں :۔ (منھ چوم کر) شاباش۔ اچھا تو وعدہ کرتے ہو کہ کل انھیں نہیں جانے دوگے؟
بیٹا :۔ سب مل کر
ماں :۔ ہاں سب مل کر۔ اچھا یہ لو دوانی۔ باہر شکور سے کہو پوریاں لا دے
چپکے سے بیٹھ کے کھا لینا۔ ابا کو خبر نہو
بیٹے کو بھیج دیگر خود اٹھی۔ وضو کیا۔ نماز ظہر پڑھی۔ گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگیں
پھر آکر اسی چارپائی پر منھ ڈھانپ لیٹ گئی۔

(۲)

آج ڈپٹی صاحب جو گھر میں آئے تو ایک سناٹا سا پایا۔ سارے مکان پر عجیب
وحشت برس رہی تھی "عظمت۔ عظمت" دو تین مرتبہ پکارا جب کوئی جواب نہ ملا تو
آگے بڑھے۔ دالان میں بیوی صاحب کو منھ لپیٹے اوندھا پڑا دیکھا تو ماتھا ٹھنکا۔
سمجھے کہ آج خیر نہیں۔ دیکھئے کیسی گذرتی ہے اندر جاکر کپڑے وپڑے اُتارے اور پنکھا
جھلتے ہوئے دالان میں آئے اور بیوی کے سرہانے کھڑے ہوکر بولے "اٹھو تو
سہی یہ آج اٹوائی کھٹوائی لے کر کیسے پڑی ہو" اتنا سنتے ہی بیوی نے تڑخ کر جواب
دیا "بس خدا کی قسم اتنا میں کہے دیتی ہوں کہ مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔ تمھیں کیا
تم جاؤ مقدمے کراؤ۔ کلکٹر صاحب کی للّو پتّو کرو۔ تمھیں کسی سے کیا مطلب۔
بچے بھوکے پھریں۔ گھر کا ستیاناس ہو۔ عزت جائے آبرو جائے۔ دشمنوں
کی جان پر بن آئے لیکن کلکٹر صاحب ناراض نہوں۔ (پھر منھ لپیٹ کر) خود تو
ایک شگوفہ چھوڑ دیں اور دوسروں کی اٹوائی کھٹوائی نکالیں"۔
ڈپٹی صاحب :۔ ہائیں، ہائیں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ تم تو جیسے بھری بیٹھی ہو!
بیوی :۔ ! ایسے ننھے ہیں۔ ابتک انہیں معاملہ ہی نہیں معلوم، آخر کل سے
میں کیا جھینک رہی ہوں وہی تمھارے کلکٹر کی جان کا رونا ہے۔

ڈپٹی صاحب :- تو آخر کلکٹر بیچارے نے تمھارا کیا بگاڑا ہی ؟

بیوی :- اسی بیچارے کا تو یہ سب کیا دھرا ہی اپنے آپ تو بنگلے میں منھ چھپا کر پڑ رہا اور تمھیں بشہ بولا بنا کر سامنے کر دیا -

ڈپٹی صاحب :- خواہ مخوہ کسی کا صبر سمیٹتی ہو - اچھا بولو - اگر انھوں نے مجھے مقدمہ دے بھی دیا تو کیا گناہ کیا ؟ میں نوکر تو ہوں نہیں حاکم پرگنہ تو میں ہی ہوں - میں نہ کروں گا تو کیا کوئی باہر سے کرنے آئے گا -

بیوی :- میں ایسی حکومت سے باز آئی - للہ تم ابھی استعفا لکھ کر دیدو - ہم اپنی روکھی سوکھی کھا رہیں گے - اگر کبھی حرف زبان پر لاؤں تو کہنا شریف زادی نہیں جا....

ڈپٹی صاحب :- تمھاری طرح کوئی ہو تو استعفا دیدے - آج اتنی مدت نوکری کرتے ہوئی - اب جو پنشن کا وقت قریب آیا تو استعفا دیدوں، خوب !

بیوی :- بھاڑ میں جائے تمھاری پنشن - ایسا بھی کیا آدمی - نہ خدا کا نہ رسول کا بس اب پنشن کے پیچھے ایمان بیچ ڈالا -

ڈپٹی صاحب :- اسلام سے اور اس سادھو سے کیا مطلب الٹی باتیں کرتی ہو -

بیوی :- تمھیں کیا خبر - بلاؤ ماما عظمت کو - ابھی بازار سے سنکر آئی ہی کہ پانسو بہادی چھرے باندھ کر اسے بچانے آئے ہیں - تمھیں اتنا بھی خیال نہیں کہ اللہ رکھے تمھارا بچا ساتھ ہی - اور پھر آج کل حمیدہ بھی یہیں ہی - گو تمھاری لڑکی سہی لیکن بیاہے پیچھے غیروں داخل - خدانخواستہ کچھ اگر دگر ہو گئی تو اُسے کدھر لیے پھروں گی اور اس کی سسرال والوں کو کیا جواب دوں گی -

ڈپٹی صاحب :- لاحول ولاقوۃ - عظمت مردار کیا جانے اور تم تو پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو - ع - آب ندیدہ موزہ کشید -

بیوی :- کچھ نہ سہی لیکن کچہری تو اب تمھیں جانے دینے سے رہی -

ڈپٹی صاحب۔ "دیکھا جائے گا"۔ کہتے ہوئے اُٹھے اور بیٹی کے کمرے میں گئے "بیٹی کچھ کھانا وانا بھی ہے"؟

بیٹی:۔ کھانا تو کل سے نہیں پکا ہے۔ تم تو شام کو کلکٹر صاحب کے یہاں پارٹی میں کھا آئے تھے۔ ہم لوگوں میں سے کسی کے مُنہ پر اُڑ کر دانہ بھی گیا ہو تو قسم لے لو (دوڑ کر باپ سے لپٹ کر) میرے ابا جان۔ تمھیں میرے سر کی قسم۔ تم کل کی چھٹی لے لو۔ کلکٹر صاحب آپ مقدمہ کر لیں گے۔

ڈپٹی صاحب:۔ توبہ۔ توبہ۔ میں کس کس سے سر ماروں یہ تو آوے کا آوا خراب ہے۔ پھر زبردستی پیچھا چھڑا کر باورچی خانے کی طرف گئے۔ وہاں دیکھا تو چولہا ٹھنڈا پڑا ہے۔ ماما عظمت کسی خیال میں ڈوبی ہوئی ہے اور اسی حالت میں بیٹھی چمٹے سے زمین کرید رہی ہے۔ ڈپٹی صاحب نے جاتے ہی پوچھا "عظمت ابتک کھانا نہیں لائی؟

عظمت:۔ نے جواب دینا تو کس کا آکر دھڑام سے ڈپٹی صاحب کے پاؤں پر گر پڑی اور لگی پھپڑ دلائے کرنے۔ "میرے میاں۔ تم اپنے محفوظ کا تو خیال کرو۔ میاں ہم لوگ بھی تمھارے دم سے روکھی سوکھی کھا پڑتے ہیں۔ میاں مجھ سے تو سارا حال تیتو لی.......

ڈپٹی صاحب پہلے تو گھبرا گئے پھر غصہ میں آکر ٹھوکر سے اِسے علیحدہ کر اپنی چارپائی پر آبیٹھے بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ آخر کو شام کا کھانا کھائے ہوئے تھے۔ صبح چند بسکٹوں سے ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔ بھوک نے جو ستایا تو سوچنے لگے کہ یہ لوگ تو یونہی سوانگ بنائے پڑے رہیں گے چل کر شکور سے کچھ بازار سے منگوانا چاہیئے۔ یہ سوچ کر اُٹھے اور دروازہ کی طرف رُخ کیا ہی تھا کہ دوڑ کر بیوی نے دامن لیا اور چلا کر کہنے لگی "اُدھر تم باہر گئے اور ادھر میں نے سر پھوڑ کر جان دیدی۔ ناں بیوی۔ سو دوست سو دشمن۔ وقت بیوقت بھی دیکھتے ہیں میں ایک منٹ کو باہر نکلنے نہ دوں گی"۔

اس وقت عجیب خلجان میں تھے۔ کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑتی

تھی عورت ذات سے دھینگا مشتی کر نہیں سکتے تھے۔ پھر یہ بھی ڈر لگا تھا کہ کہیں ضد میں سچ مچ نہ نقصان پہنچا لے۔ بیچارے چپ چاپ واپس آکر اپنے پلنگ پر لیٹ گئے اور تخیل میں مستغرق ہو گئے اور سوچنے لگے کہ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ بیوی ایک بیڑی کے مانند ہوتی ہے۔

(۳)

اس وقت ڈپٹی صاحب کے گھر میں ایک کہرام مچا ہوا ہے۔ بیٹی میز سے ٹیک لگائے دھاڑیں مار کر رو رہی ہے۔ لڑکا ٹانگوں میں لپٹا ہوا چیخیں مار رہا ہے۔ ماما الگ دہائی دے رہی ہے بیوی دروازہ روکے کھڑی ہیں اور قسموں پہ قسمیں دے رہی ہیں "تمہیں خدا رسول کی قسم تمہیں تینوں یاروں کی قسم جو آج کچہری جاؤ۔ زیادہ سے زیادہ بس آج کی تنخواہ کٹ جائیگی تو میں ساری تنخواہ تم پر سے نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ میں تو آج ہرگز نہ جانے دونگی۔ ذرا مُنہ دیکھے جو قدم باہر نکالے۔ تمہیں اپنے محفوظ کی قسم جو آج جاؤ"۔ غرض کہ بیوی کا یہ منتیں کرتے کرتے مُنہ سوکھا جا رہا ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب نہ اِدھر ہٹتے ہیں نہ اُدھر۔ بُت کی طرح ششدر کھڑے ہیں۔ غصہ اور شرم کی وجہ سے چہرہ پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر تو اسی طرح کھڑے رہے پھر کچھ سوچکر لڑکے کو علیحدہ کیا اور بیوی کو ایک دھکا دیکر جلدی سے دروازہ کے باہر آگئے۔ اُدھر ماں بیٹیاں ہاتھ پھیلائے آدھی آدھی باہر نکل آئیں۔ اِدھر جو یہ جلدی میں آگے بڑھے تو کرسی میں پاؤں اُلجھا اور اَرّا ڑا دھم زمین پر آرہے ہَیٹ دور جا پڑا۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تیزی سے اُٹھ بیٹھے۔ اور ہیٹ ہاتھ میں لیکر ورہیں جو آئے تو داڑھی چق میں اُلجھ گئی۔ غصہ میں آکر نوچ لی اور لپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور کوچوان کو حکم دیا کہ جلدی گاڑی ہانکے۔ جیسے گاڑی چلی پیچھے پیچھے محفوظ اور عظمت روتے اور چلّاتے ہوئے بھاگے۔ عظمت تو بنگلے کے احاطے تک آکر رُک گئی محفوظ کو ا۔ کہ ڈانٹا دھمکایا۔ وہ کچہری تک اسی طرح چلا آیا کچہری کے دروازہ پر گاڑی رُکی اور ڈپٹی صاحب "لاحول ولا قوۃ! عورتیں بھی کیا ناقص العقل ہوتی ہیں" کہتے

ہوئے اُتر پڑے - کوچوان نے تبسم زیرلب کے ساتھ مُنھ پھیر لیا- اتنے میں محفوظ بھی ہچکیاں
کرتا ہوا آگیا اور ڈپٹی صاحب کوچوان کو اشارہ کرکے گھسٹ سے اندر داخل -

(۴)

"مہاتما گاندھی کی جے - محمدؐ علی شوکت علی کی جے"- ان آوازوں کا سننا تھا کہ ڈپٹی صاحب
کی بیوی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے- دونوں ہاتھوں
سے کلیجہ تھامے دروازے کو بھاگی آئیں- دروازے سے جو دیکھتی ہیں تو ایک جم غفیر
ہے ایک انبوہ کثیر ہے کھوے سے کھوا چھل رہا ہے- یہ دیکھتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں
پھول گئے اور وہیں بیٹھ کر "یا حفیظ" کا ورد کرنے لگیں کوئی آدھ گھنٹہ میں جب شور کم ہوا اور
لوگ دھوپ سے تنگ آکر سایے کی تلاش میں منتشر ہونے لگے تو چند آدمیوں نے اس
بنگلہ کی جانب بھی رُخ کیا- یہ دیکھکر بیگم صاحبہ پھر کھڑی ہوگئیں اور چلانے لگیں"- اری
او عظمت اری سنتی نہیں کمبخت - کیا سانپ سونگھ گیا- جا دیکھ تو سہی - باہر یہ لوگ ادھر
کیسے آرہے ہیں- شاید دھوپ کی وجہ سے پریشان ہو گئے ہیں درختوں کے نیچے بیٹھنا
چاہتے ہیں- جا ان سے سب حال پوچھ گچھ ، اور دیکھ! بڑی خاطر کی باتیں کیجیو- شاید خدا
مہربان ہو جائے اور یہ مصیبت ہم پر سے ٹل جائے"!

عظمت - یہ حکم پاکر فوراً باہر دوڑی آئی اور سب سے بڑی خوشامد کی باتیں کرنے لگی-
"ہماری بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ کہیں ہم تم سے باہر تھوڑی ہی ہیں صرف پیٹ کی خاطر یہ جتن
کرتے ہیں- ویسے کیا ہم مسلمان نہیں ہیں- تم سب ہمارے ہی بھائی بند ہو یہ گھر اپنا ہی
سمجھو اور آرام سے بیٹھو پھر ایک نوجوان سے جو سرتاپا گاڑھے کے کپڑے پہنے ہوئے
ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیے آگے آگے تھے پوچھنے لگی "کیوں بھیا آخر کیا ہوا؟"
اس نے لاپرواہی سے جواب دیا "کچھ نہیں، اُنھیں چند گھنٹوں کے لیے روک لیا گیا
ہے- ہم سب بھی اپنے کو ان کے ساتھ قیدی تصور کرتے ہیں- اب تھوڑی دیر میں ان کو

لے کر جائیں گے"۔ اس کے بعد ایک نوعمر سے مولوی صاحب نے آگے بڑھکر ماما سے بہت کچھ تسلی دلاسے کی باتیں کیں۔ اور کہا۔ "تم اپنی بیگم صاحبہ سے کہدینا کہ وہ اطمینان سے گھر میں بیٹھیں۔ ہم بھی انھیں اپنی ماں سمجھتے ہیں"۔ پھر تو ماما خوش خوش گھر میں آئی اور بیگم صاحبہ سے کہنے لگی۔

ماما :۔ یہ تو بڑے ہی اچھے لوگ ہیں آپ ذرا نہ گھبرائیں۔ لاؤ ان لوگوں کو ہاتھ منہ دھونے کو پانی وانی دے آؤں آپ جب تک پان بنائیں"۔

یہ کہکر ماما عظمت تو گھڑے باہر لیجانے لگی اور بیگم صاحبہ نے تھالی بھر کر پان لگائے محفوظاً سے ماما کو آواز دلوا کر تھالی دیدی۔ ماما نے سب کو پانی پلایا۔ پان بانٹے، غرض کہ خوب خاطر داری کی۔ تھوڑی دیر میں نماز پڑھنے کا وقت آگیا۔ یہ لوگ تجویز ہی کر رہے تھے کہ کہاں نماز پڑھی جائے اتنے میں لڑکے نے آکر کہا۔ "ہماری اماں کہتی ہیں کہ آپ لوگ یہیں نماز پڑھیں ہم ابھی سب انتظام کیے دیتے ہیں"۔

بس ایک ذرا سی دیر میں فرش۔ پانی۔ لوٹے سب آموجود ہوئے لوگوں نے وضو کیا نماز پڑھی۔ ابھی نماز ختم ہی ہوئی تھی کہ پھر پانوں کی تھالیاں تیار تھیں۔ سب نے خوب کھائے۔

بیگم صاحبہ۔ یہ ساری باتیں دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی ماما پان کھلا کر اندر آئی پوچھا کیوں ری یہ لڑکے سے کون مولوی صاحب ہیں"۔

ماما :۔ کون سے ؟

بیگم صاحبہ :۔ ارے یہی گورے گورے جو سنہری عینک لگائے پٹھے رکھے ہوئے ہیں۔

ماما :۔ جنھوں نے نماز پڑھائی تھی ؟

بیگم :۔ ہاں ہاں وہی ۔

ماما :۔ نہ معلوم بیگم یہ کون ہیں لیکن ہیں بڑے میاں آدمی۔ انھیں نے مجھ سے بڑی تسلی

کی باتیں کی تھیں۔ اللہ جیون پہ جیتا رکھے۔ انکا احسان تو تمام عمر نہ بھولیں گے۔
بیگم صاحبہ:- اللہ ماں بابا کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے دیکھو تو کیسا بھولا بھالا چہرہ ہے۔
غرض کہ ابھی تک بیگم صاحبہ کے اوسان خطا تھے اب جو ذرا اطمینان ہوا تو لگیں مزے مزے سے تماشا دیکھنے۔ تھوڑی دیر تک تو یہ لوگ یہیں ٹھہرے رہے ذری دیر کے بعد ایک دم ہلڑ مچا۔ اور سب لوگ کچہری کی طرف بھاگنے لگے۔ بیگم صاحبہ نے جلدی سے ماما کو بھیجا کہ جا کر دیکھ تو کیا ہوا۔
ماما:- باہر گئی تو یہ لوگ بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے چلائے کہ "اب وہ چھٹ گئے ہم جاتے ہیں"۔
ان کے چلے جانے کے بعد سب کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں کہ اب ڈپٹی صاحب آتے ہیں اب آتے ہیں۔ ہر آہٹ پر سب ادھر ہی دیکھنے لگتے تھے کہ اتنے میں ڈپٹی صاحب دروازے سے نمودار ہوئے۔ سب کے سب کھڑے ہو گئے۔
ڈپٹی صاحب نے آتے ہی فرمایا "دیکھو کیسا خوش اسلوبی سے معاملہ ٹال دیا۔ اب ڈرانا ورانا نہیں خدا نے خیریت سے گذار دی"۔ ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

"راز"

خلاصہ تاریخ اندلس

خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے زمانہ میں موسیٰ بن نصیر افریقہ کا والی تھا۔ عیسائیوں کے بحری غارتگریوں سے تنگ آکر اسنے یہ ارادہ کیا کہ اندلس کو فتح کرے۔ خلیفہ سے اجازت کی درخواست کی۔ اس نے لکھا کہ پہلے ایک لشکر بھیجو تاکہ وہاں کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ موسیٰ نے ۹۱ھ میں اپنے ایک غلام طریف کو چار سو آدمیوں کے ہمراہ چار کشتیوں میں بھیجا۔ اسنے پہنچکر خضراء کو تاخت و تاراج کیا اور وہاں سے مال غنیمت لیکر واپس آیا۔ یہ دیکھ کر اس نے اپنے دوسرے غلام طارق کو جو اس کے مقدمہ لشکر پر متعین تھا سات ہزار بربری سپاہیوں کے ساتھ کشتیوں میں روانہ کیا۔ طارق اس مقام پر اترا جو ابتک اس کے نام سے جبل الطارق بولا جاتا ہے اور اس نے خضراء کو فتح کر لیا۔ شاہ اندلس راڈرک نے مقابلہ کے لیے ایک لاکھ فوج جمع کی۔ طارق نے موسیٰ کو امداد کے لیے لکھا اس نے پانچ ہزار فوج اور بھیجدی اور بارہ ہزار کی تعداد پوری کردی جس کو بالعموم مسلمان امرار فوج کسی ملک کے فتح کرنے کے لیے کافی سمجھا کرتے تھے۔ طارق مجاہد فی سبیل اللہ تھا۔ اس نے اپنے جہازوں میں بھی آگ لگادی اور اپنی فوج سے کہا کہ اب واپسی کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ یا فتح یا موت۔ راڈرک کی فوجیں دنیا کے لیے لڑ رہی تھیں اور ان کے دل بھی باہم متحد نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے شکست کھائی۔ اور شذونہ کے متصل دریائے لکہ میں ڈوب کر مرگیا۔ اور اس کی فوج ہزیمت اٹھاکر بھاگی۔

موسیٰ کو جب اس فتح کی خبر ملی تو وہ خود ایک عظیم الشان لشکر لیکر ۹۲ھ میں قیروان سے روانہ ہوکر اندلس میں گیا۔ اور تمام اندلس فتح کرلیا۔ اس نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ وسط یورپ کو فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے دمشق میں جاکر خلیفہ سے ملے۔ لیکن جب اس کی اطلاع

ولیدکو دی تو اس نے کہا کہ راستہ نہایت دشوارگذار ہے۔ اس لیے اس میں کامیابی مشکل ہے۔ اس وجہ سے وہ باز رہا۔

اندلس کو فتح کرنے کے بعد موسیٰ نے اس کی سرحدوں پر فوجی چھاونیاں قائم کیں اور قرطبہ کو صدر مقام قرار دیکر وہاں کا والی اپنے بیٹے عبدالعزیز کو بنایا۔ اور خود تحفے اور ہدیے لیکر دربار خلافت میں آیا۔

اندلس اس وقت سے بنی امیہ کی خلافت میں شامل ہوگیا۔ اس کا والی کبھی خود خلیفہ براہ راست مقرر کرتا تھا۔ کبھی اس کو والیِ افریقہ کے ماتحت کر دیتا تھا وہ کسی کو والی بنا کر بھیجتا تھا۔ موسیٰ بن نصیر کے بعد وہاں کے ولاۃ فتح کی تکمیل اور مفتوحہ رقبہ کے بڑھانے میں مصروف رہے اور برشلونہ وغیرہ کو فتح کیا۔ وہاں کے جو باشندے اسلامی حکومت کے خلاف تھے وہ قشتالہ اور اربونہ کے پہاڑوں میں جاکر پناہ گزیں ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کے قلت تعداد پر نظر کرکے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ سرحدوں پر چھیالیس سال تک یورپین قوموں سے جنگ جاری رہی۔ امیر عبدالرحمٰن غافقی والی اندلس نے ایک بار یہ چاہا کہ فرانس کو فتح کرلے تاکہ یہ سلسلہ وار لڑائیاں موقوف ہوجائیں۔ چنانچہ اس نے ۱۱۴ھ میں چڑھائی بھی کی لیکن غنیم کی قوت کا اندازہ صحیح نہیں کیا۔ اس وجہ سے شکست کھاکر واپس آگیا۔

مشرق میں جب بنی امیہ میں خانہ جنگیوں کی وجہ سے ضعف پیدا ہوگیا اور وہ دور دست صوبوں کے انتظام کی طرف توجہ نہ کر سکے تو اندلس کی حالت طوائف الملوکی کی ہوگئی۔ اور عربوں میں قبائلی عصبیت کا جاہلانہ جوش جس نے خراسان میں ان کو تباہ کیا یہاں بھی پیدا ہوگیا۔ اور اہل یمن اور مضر میں باہم سخت دشمنی ہوگئی۔ ہر ایک قبیلہ کی یہ کوشش تھی کہ اندلس کی امارت ہمارے رئیس کو ملے۔ بہت کچھ جھگڑوں کے بعد آخر اس بات پر ان میں اتفاق ہوا کہ ایک سال مضری امیر رہے اور ایک سال یمنی اسی قرارداد کے مطابق یوسف بن عبدالرحمٰن مضری امیر بنایا گیا۔ جب سال پورا ہوچکا تو اہل یمن نے مجتمع ہوکر اس سے

کہا کہ اب تم امارت چھوڑ دو۔ اور ہمارے امیر کے حوالہ کرو۔ اس نے رات کو غداری سے اہل یمن کی ایک جماعت کثیر کو قتل کرا دیا۔ اور اندلس کا مستقل امیر بن بیٹھا۔

عبدالرحمٰن داخل

اسی دوران میں بنی عباس نے ۱۳۲ھ میں مشرق میں بنی امیہ سے تخت خلافت چھین لیا۔ اور انتہا درجہ کی قساوت قلبی کے ساتھ ان کو فنا کرنے لگے۔ ان میں سے ایک شخص عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام بن عبدالملک بن مروان اپنی جان بچا کر صرف ایک غلام کے ساتھ ۱۳۸ھ میں بھاگ کر اندلس میں داخل ہو گیا۔ یہاں اہل یمن اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس نے یوسف کو شکست دیکر اندلس پر قبضہ کیا۔ اور اپنے حسن انتظام سے وہاں کے تمام کام ٹھیک کر لیے۔ دفاتر اور دواوین کو ترتیب دیا۔ فوج کو نہایت طاقت ور بنایا اور ایسی عظیم الشان سلطنت قائم کی کہ بنی عباس اس سے ڈرنے لگے۔ ۱۷۲ھ میں وفات پائی۔ قرطبہ کی مشہور جامع مسجد اسی نے بنوائی تھی۔

ھشام

اس کے بعد اس کا بیٹا ھشام امیر ہوا۔ نہایت عادل اور نیک سیرت تھا لوگ اس کو عمر بن عبدالعزیز ثانی سمجھتے تھے۔ اس کو شکار کا زیادہ شوق تھا جب اس نے قرطبہ کا مشہور پل تعمیر کرایا تو ایک دن اپنے وزیر سے پوچھا کہ اہل قرطبہ میری بابت کیا کہتے ہیں وزیر نے کہا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر نے یہ پل محض اس لیے تعمیر کرایا ہے کہ اس پر سے گذر کر شکار گاہ کی طرف جایا کرے۔ اس کا اس کے اوپر اس قدر اثر ہوا کہ اس نے اسی دن سے شکار قطعاً چھوڑ دیا۔ فوج کو اس نے اور بھی قوی تر بنایا۔ دشمنوں کے ساتھ جہاد ہمیشہ جاری رکھتا تھا۔ مدینہ میں امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ کاش ہمارا خلیفہ بھی ھشام جیسا ہوتا۔ اس نے ۱۸۰ھ میں وفات پائی۔

حکم

ھشام کے بعد اس کا بیٹا حکم تخت نشین ہوا۔ اور عیاشی شروع کی۔ علماء اور خاصکر یحییٰ بن یحییٰ نے جو امام مالک کے شاگرد تھے اس کی معزولی کا فتویٰ دیا۔ اس نے انکار کیا۔ اس پر ایک فتنۂ عظیم برپا ہوا جس میں وہ اپنی طاقت کی وجہ سے غالب

رہا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ لہو ولعب کو چھوڑ کر مہمات سلطنت کی طرف متوجہ ہوا۔ تدبیر ملکی اور شجاعت میں اس نے بڑا نام پایا۔ قرب وجوار کی سلطنتوں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ اس کے زمانہ میں اندلس میں ایک بار سخت قحط پڑا۔ اس نے ایسا اچھا انتظام کیا کہ رعایا کو بہت آسائش ملی۔ ایک بار وہ اپنے ایک غلام پر خفا ہوا۔ اور حکم دیا کہ اس کا ہاتھ کاٹ لو۔ امام مالک کے شاگرد زیاد موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے میرے استاد امام مالک نے یہ حدیث سنائی ہے کہ جو شخص اپنے غصہ کو دبالے گا اللہ تعالیٰ اسکو قیامت کے دن امن عطا کریگا۔ اس نے کہا کہ واقعی امام نے تم سے یہ حدیث بیان کی۔ زیاد نے کہا کہ واقعی اسی وقت غلام کے قصور کو معاف کر دیا۔ اس کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی۔

عبدالرحمٰن ثانی

حکم کے بعد اس کا بیٹا عبدالرحمٰن ثانی امیر ہوا۔ یہ علوم شرعیہ اور فلسفہ میں یگانہ عصر تھا۔ اس کا زمانہ امن اور رفاہیت کا زمانہ تھا نہ قحط نہ لڑائی نہ اندرونی شورش۔ اس لیے اسنے بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ پہاڑوں کے سوتوں اور چشموں سے پانی لاکر باغات میں نہریں جاری کیں اور فوارے لگوائے۔ امرار نے بھی تعمیر کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور ہر ہر شہر میں بڑے بڑے قصور اور محلات بن گئے۔ اس نے قرطبہ کی جامع مسجد کو بھی بڑھایا۔ اور اپنے دربار کے شاہی آداب و دستور مرتب کیے۔ اس کے زمانہ میں اندلس کے دربار کی شاہانہ شان وشوکت بہت بڑھ گئی۔

ادھر بغداد میں مامون عباسی کا زمانہ تھا۔ اس کے مقابلہ سے قسطنطنیہ کے بادشاہ نوفلس نے عاجز آکر امیر عبدالرحمٰن کے پاس ہدیے اور تحفے بھیجے اور اس کے ساتھ دوستی کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ تاکہ ان دو اسلامی سلطنتوں کو آپس میں دشمن بناکر لڑادے اور خود بے خوف ہوجائے۔ امیر عبدالرحمٰن نے اس کے ہدیے قبول کیے۔ اور اپنی طرف سے اپنے ایک درباری یحییٰ غزال کو تحفوں کے ساتھ

اس کے دربار میں بھیجا - اور رشتۂ دوستی قائم کیا -

عبدالرحمن نغمہ اور سرود کا بڑا عاشق تھا - اس کی وارفتگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرق کا مشہور مغنی زریاب جب اندلس میں گیا تو یہ خود اس کے استقبال کے لیے نکلا اس نے ۲۳۸ھ میں وفات پائی -

محمدؒ

عبدالرحمن کے بعد اس کا بیٹا محمدؒ اس کا جانشین ہوا - طلیطلہ کے لوگ اس کے برخلاف ہو گئے - اور نادانوں نے اسلام کے دشمنوں بادشاہ جلیقیہ اور فرمانروائے بشکنس سے مدد مانگی - وہ تو اسی کی آرزو میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو آپس میں لڑائیں فوراً آمادہ ہو گئے - لیکن محمدؒ ایک زبردست طاقت لیکر پہنچ گیا - اور سب کو مار کر بھگا دیا تقریباً بیس ہزار دشمنوں کی لاشیں میدان میں بے گور و کفن پڑی تھیں -

جو لوگ متفقہ دشمن سے مدد لیتے ہیں سب سے پہلے اس دشمن کے ہاتھ سے وہی خود تباہ ہوتے ہیں - چنانچہ جب اندلس کی تباہی شروع ہوئی تو یہی اہل طلیطلہ جو ان دشمنوں پر بھروسہ کیا کرتے تھے سب سے پہلے ان کے پنجہ میں پھنسے - اور کوئی ان کو چھڑانے والا نہ تھا - محمدؒ نے ۲۷۳ھ میں وفات پائی -

منذر و عبداللہ

محمدؒ کے بعد اس کا بیٹا منذر امیر ہوا - لیکن وہ صرف دو سال رہا اور کوئی کارنامہ نہیں چھوڑا - اس کے بعد محمدؒ کا دوسرا بیٹا عبداللہ تخت پر آیا - اس کے زمانہ میں بغاوتیں اور شورشیں برپا ہوئیں - ملک کی آمدنی کم ہو جانے کی وجہ سے قرضہ کا بوجھ سلطنت پر زیادہ ہو گیا - اس کی وفات ۳۰۰ھ ہوئی -

عبدالرحمن ناصر

یہ عبداللہ کا پوتا ہے - اس کے بعد تخت سلطنت پر آیا - اس نے اپنی دانشمندی اور حسن تدبیر سے تمام اندرونی شورشوں کو مٹا دیا - دشمنوں سے جہاد کرنے کے لیے خود جایا کرتا تھا - لیکن ایکبار اس کا بدباطن اور خیانت کار وزیر اس کے دشمن ردمیر سے مل گیا - جس کی وجہ سے اس کی فوج نے شکست کھائی

اس وقت سے خود جانا ترک کر دیا اور امراء کے ساتھ فوج بھیجنے لگا۔ اس کے زمانہ میں اندلس کی عظمت و شان انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ طاقت اور شوکت اسقدر بڑھی کہ یورپ کے سلاطین کے خطوط اور وفود ہر قسم کے تحائف لے کر آنے لگے اور ہاتھ چومنے لگے۔ رومتہ الکبرے نیز قسطنطنیہ سے بھی سفراء اس کے آستانہ پر پہونچے اور اس کے دربار کی ہیبت اور جلالت دیکھ کر ان کے دلوں پر رعب قائم ہو گیا۔ بنی عباس مشرق میں چونکہ کمزور ہو گئے تھے۔ اور خلافت کے فرائض کے انجام دینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ادھر افریقہ میں بنی فاطمہ نے اپنی خلافت قائم کر لی تھی جو رفض اور انسان پرستی پھیلاتی تھی اور دین کی دشمن تھی اس لیے عبدالرحمٰن ناصر نے اپنی خلافت کا اعلان کیا اور اپنا لقب امیرالمومنین رکھا۔ ورنہ اس سے پہلے اندلس کے بادشاہ خلیفہ نہیں کہے جاتے تھے صرف امیر تھے۔

عبدالرحمٰن علماء کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ اور علم کا سرپرست تھا۔ اس کے زمانہ میں قرطبہ کی علمی شان دنیا بھر میں بڑھی ہوئی تھی۔ خوش نصیبی سے اس کا زمانہ بھی زیادہ رہا۔ پورے پچاس برس حکومت کر کے ۳۵۰ھ میں اس نے وفات پائی۔ باوجود اس عظیم الشان سلطنت اور شان و شوکت کے اس نے ایک بار اپنی کل زندگی کے خوشی کے دن شمار کئے تو صرف ۱۴ دن نکلے حقیقت یہ ہے کہ وہ امراء جو امت کی سعادت اور مصلحت کے لیے کام کرتے ہیں دنیا میں ان کو بہت کم آسائش نصیب ہوتی ہے۔ ان کے عیش کا گھر دار آخرت ہے۔

الحکم المستنصر اپنے باپ ناصر کے بعد خلیفہ ہوا۔ جلالقہ نے جو ناصر سے ڈرتے تھے اس کے مرنے کے بعد حملہ کیا۔ حکم نے ایسی قوت اور شجاعت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا کہ وہ مغلوب ہو گئے۔ اور صلح پر مجبور ہوئے۔ حکم نے اس شرط پر صلح کی کہ اسلامی سرحد کے قریب جس قدر تمہارے قلعے ہیں سب کو منہدم کر دو۔

حکم نہایت علم دوست اور علم پرور خلیفہ تھا۔ اس کے زمانہ میں علوم نے اور بھی ترقی پائی۔ اس کے کریمانہ اخلاق کی وجہ سے ملکوں ملکوں کے اہل علم اس کے پاس آکر جمع ہوئے۔ اور ہر قسم کے ہنر اور فن رائج ہوئے۔ اس نے اپنے کتب خانہ میں جس قدر کتابیں جمع کی تھیں۔ ان کے ناموں کی فہرست ۴۴ جلدوں میں تھی۔ شراب کو اس نے اپنی سلطنت سے بالکل فنا کردیا۔ اس کی وفات ۳۶۶ھ میں ہوئی۔

ھشام ثانی المویّد اپنے باپ حکم کے بعد خلیفہ ہوا۔ لیکن اس کی عمر صرف ۹ سال کی تھی۔ اس لیئے اس کی طرف سے وزیر محمد بن ابی عامر خلافت کا کام انجام دیتا تھا اس وزیر۔ کے مزاج میں نہایت سخت استبداد تھا۔ اس نے تمام امور سلطنت کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ امرا جو اس کے مخالف تھے ان کو آپس میں لڑوا کر قتل کروا دیا۔ جو بچے ان کو خود مٹا دیا۔ افریقہ سے بربری قوم کو بلا کر ایک زبردست فوج مرتب کی۔ اور ان کی طاقت سے اپنے نفوذ اور اقتدار کو غالب کرلیا۔ سلطنت کا سیاہ و سپید سب اس کے ہاتھ میں تھا۔ ھشام کا نام صرف صرف سکہ پر ہوتا تھا خطبہ میں بھی اس کے نام کے بعد ابو عامر کا نام لیا جائے گا۔ اس نے اپنے لیے ایک شہر تعمیر کرایا اور اس کا نام الزاھرہ رکھا۔ اس کی نشست و برخاست اور اس کے دربار کے آداب و رسوم سب شاہانہ تھے۔ قرطبہ میں دریا پر اس نے ایک پل تعمیر کرایا جس میں ایک لاکھ چالیس ہزار اشرفیاں صرف کیں۔ اس میں باوجود ان خرابیوں کے ایک خوبی یہ تھی کہ نہایت جری اور جنگ و جہاد کا شیدائی تھا۔ دشمنوں اور ہمسایہ سلطنتوں پر اس نے اپنی شوکت غالب رکھی ۳۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا عبد الملک مظفر وزیر ہوا۔ اس نے بھی بالکل اپنے باپ کا طریقہ رکھا۔ اور سیاست اور جہاد میں اس کے نقش قدم پر چلا۔ سات سال کے بعد جب وہ بھی انتقال کرگیا تو اس کا بھائی عبد الرحمٰن وزیر ہوا اس نے یہ چاہا کہ خود خلیفہ ہو جائے۔ ھشام سے اپنی ولی عہدی کا فرمان بھی لکھوا لیا۔ یہ دیکھ کر

ارکان دولت بگڑ بیٹھے۔ اور ہشام کو تخت خلافت سے اُتار کر محمد بن عبد الجبار بن ناصر کو خلیفہ بنایا اور اس کا لقب مہدی رکھا۔

مہدی

مہدی کے خلیفہ ہو جانے کے بعد عبدالرحمٰن اور اس کے باپ کی بربری فوج کا رتبہ گر گیا۔ اس لیے انہوں نے سازش کر کے ہشام بن سلیمان بن ناصر کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کو خلیفہ بنا کر مہدی کے مقابلہ کھڑا کیا۔ اور اس کا لقب مستعین باللہ رکھا۔ اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے قشتالہ کے بادشاہ انفانسو خاص سے مدد کے طلب گار ہوئے اس نے ایک لشکر گراں ان کی امداد کے لیے بھیجا۔ اور خود بھی آیا۔ مہدی کی فوج کے تقریباً بیس ہزار آدمی مارے گئے اور قرطبہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مستعین باللہ وہاں قابض ہو گیا۔

اب مہدی نے بھی وہی غلطی کی یعنی انفانسو سے جا کر مدد کا طالب ہوا۔ وہ پھر ایک فوج لے کر مہدی کے ساتھ آیا۔ اور مستعین باللہ کو شکست دیکر وہاں سے نکال دیا مہدی قرطبہ میں داخل ہوا۔ اور مستعین اور بربری فوج نکل کر ادھر ادھر لوٹ مار کرنے لگے مہدی اور انفانسو دونوں ان کے تعاقب میں چلے مستعین نے ان کو شکست دیدی۔ مہدی نے قرطبہ میں آ کر ہشام موئد کو قید سے نکال کر خلیفہ بنا دیا۔ اور خود حاجب ہو گیا۔ اہل قرطبہ کو خوف ہوا کہ کہیں بربری فوج حملہ آور نہ ہو ورنہ شہر تباہ ہو جائیگا اس وجہ سے انہوں نے متفق ہو کر مہدی کو قتل کر دیا۔ اور ہشام کو خلیفہ رکھا۔ لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ کیونکہ مستعین نے آ کر محاصرہ کر لیا۔ اور چند دنوں کے محاصرہ کے بعد فاتحانہ شہر میں داخل ہوا۔ اور جو کچھ خطرہ تھا وہی پیش آیا۔ یعنی تباہی اور مصیبت قرطبہ میں پھیل گئی۔ اور نہایت خونریزی ہوئی۔

ان دنیا پرست اور خود غرض امرار نے اپنی ان کارروائیوں سے خود اپنی طاقت اور شوکت کو برباد کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ہر صوبہ خود مختار بن گیا۔ اور بنی امیہ

کی طاقت بہت کمزور ہو گئی۔

مغربی افریقہ کے شہر سبتہ میں ایک علوی امیر تھا جس کا نام علی بن حمود تھا۔ وہ بنی امیہ کی کمزوری کو دیکھ کر بحر کو عبور کر کے اندلس میں آگیا قرطبہ کو فتح کر کے خلیفہ بن بیٹھا۔ اور اپنا لقب متوکل علی اللہ رکھا۔

ملوک طوائف اشبیلیہ میں بنی عباد نے بطلیوس میں بنی افطس نے۔ طلیطلہ میں اسماعیل بن ذی النون نے۔ سرقسطہ میں بنی ہود نے طرطوشہ میں لبیب عامری نے اور بلنسیہ میں منصور مغافری نے اپنی اپنی مستقل سلطنتیں قائم کر لیں اسلامی دولتوں کے اس شقاق و افتراق کو دیکھ کر قشتالہ کا بادشاہ انفانسو ساوس جو مسلمانوں کی سلطنت کی بدولت ان ملکوں کی خوشحالی اور ترقی کو دیکھ کر ان کے واپس لینے کی تدبیریں کر رہا تھا موقع پا کر حملہ آور ہوا۔ سب سے پہلے اس نے طلیطلہ کو قادر باللہ کے ہاتھ سے سات سال کے محاصرہ کے بعد چھین لیا۔ پھر اس کے آگے قلعوں کو یکے بعد دیگرے لینا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر امیر اشبیلیہ معتمد بن عباد کو خطرہ پیدا ہوا اس زمانہ میں مراقش میں یوسف بن تاشفین امیر المسلمین تھا اور اس کی طاقت اور شوکت زبردست تھی۔ معتمد اسی کے پاس کمک طلب کرنے کے لیے گیا۔ وہ ایک عظیم الشان جنگی بیڑا لیکر اندلس کے سواحل پر پہونچا۔ اور وہاں فوجوں کو اتار کر انفانسو کے مقابلہ کے لیے بڑھا انفانسو نے شکست فاش کھائی۔ یوسف نے یہ دیکھ کر کہ یہاں کے امرا میں نہایت دشمنی ہے اور ہر ہر شہر میں ایک ایک سلطنت جداگانہ ہے یہ مناسب سمجھا کہ خود قبضہ کر کے تمام ملک کو ایک علم کے نیچے لائے چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اب اندلس مراقش کا ایک صوبہ اور ملثمین کے تابع ہو گیا۔

یوسف نہایت نیک سیرت۔ شجاع اور علم پرور امیر تھا۔ اس نے ۵۰۰ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بھائی امیر ہوا۔ اس کے عہد میں سرقسطہ پر اور نیز اندلس

کے بعض دیگر قلعوں پر فرانسیسیوں نے اپنا تسلط جما لیا۔ اور ملثمین ان کی حفاظت نہ کر سکے کیونکہ ادھر عبداللہ بن تومرت نے ان کے مقابلہ کے لیے اپنی مہدویت کا علم بلند کیا تھا۔

عبدالمومن عبدالمومن بن علی اس کے مددگاروں میں سے تھا۔ چنانچہ اس نے ۵۴۲ھ میں مراکش پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر ایک فوج اندلس کی طرف روانہ کی۔ اور جا بجا ملثمین کو شکست دیکر تمام ملک کو اپنے جھنڈے کے نیچے لایا۔ فرانسیسیوں سے بھی مقابلہ کیا۔ اور بہت سے قلعے بھی واپس لیے۔ اگر اس کی زندگی وفا کرتی تو وہ طلیطلہ کو چھڑا لیتا۔ لیکن اس کی موت نے عجلت کی اور وہ ۵۵۸ھ میں فوت ہو گیا۔ اسی کا آباد کیا ہوا شہر جبل الطارق ہی جس پر آج کل انگریزوں کا قبضہ ہی۔ اس کے بیڑہ میں چار سو جہاز تھے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمدؐ امیر ہوا لیکن وہ نالائق۔ غصہ ور۔ زود رنج۔ بزدل اور شراب خوار تھا۔ اس لیے ڈیڑہ مہینہ کے بعد اسکو تخت سے اُتار دیا۔

یوسف پھر اس کا بھائی یوسف بن عبدالمومن امیر ہوا۔ وہ ۵۶۱ھ میں فوج لیکر اندلس میں گیا۔ مشرقی اندلس کو محمد بن مردنیش کے ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر اشبیلیہ میں پہنچا۔ اور وہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی۔ انفانسو ہاوس کے زمانہ میں قرطبہ کی طرف بڑھا۔ سامنے پہنچکر مقابلہ کیا اور وہاں سے شکست دیکر اس کو ہٹا دیا۔ پھر سنترین کی طرف بڑھا۔ اس کے محاصرہ میں اس کو زخم لگا۔ اور وہ واپس چلا آیا۔ مراکش میں پہنچکر ۵۸۰ھ اسی کی وجہ سے انتقال کر گیا۔

یوسف بہت بڑا عالم اور فقیہ تھا۔ تدبیر اور ملک داری میں وہ سلاطین عظام میں شمار کیا جاتا ہی۔ اس کے ندیموں میں اسلام کا مشہور فلسفی ابن رشد تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔

منصور اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یعقوب امیر ہوا۔ اس کا لقب منصور رکھا گیا۔ اس کے عہد میں ارض مقدس شام میں سلطان صلاح الدین ایوبی

رحمۃ اللہ علیہ اور سلاطین یورپ کے درمیان صلیبی جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ صلاح الدین بڑی طاقت میں اپنے حریفوں کا اچھی طرح مقابلہ کر لیتا تھا لیکن اس کے پاس بحری اسطول نہ تھا۔ اس لیے اس نے منصور کو لکھا کہ تم اپنے بیڑہ سے میری مدد کرو۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ محض اس وجہ سے کہ سلطان نے اس کو امیر المومنین نہیں لکھا تھا اس نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ یہ انتہا درجہ کی تنگ عقلی کی مثال ہے۔

منصور کو چونکہ افریقہ ہی میں اپنے بعض مخالفین سے بار بار لڑنا پڑا اس وجہ سے اسکو اندلس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ مل سکی۔ یہ دیکھ کر قشتالی اور پرتگالی بادشاہوں نے وہاں اسلامی سرحدوں کو عبور کرنا شروع کیا۔ منصور کو جب یہ خبریں ملیں تو ۵۹۱ھ میں ایک زبردست فوج لے کر وہ اندلس میں پہنچا۔ مقام اراک میں عیسائیوں کا مقابلہ ہوا۔ اور شاہ قشتالہ نے ایسی شکست فاش کھائی کہ اس ملک سے آج تک عیسائیوں نے ایسی شکست نہیں اُٹھائی تھی۔ پھر منصور نے بڑھکر بہت سے قلعے واپس لیے پھر طلیطلہ کی طرف بھی حملہ آور ہوا۔ اور قلعہ ریام۔ وادی حمارہ اور ندرید چھین لیا اس نے جا بجا عمارتیں اور مساجد بنوائیں۔ منصور نے اگر صلاح الدین کے ساتھ امداد میں بخل نہ کیا ہوتا تو وہ نامور امراء کی فہرست میں شامل ہو سکتا تھا۔

ناصر الدین اللہ

۵۹۵ھ میں منصور اپنے بیٹے محمد ناصر الدین کو اپنا قائم مقام کر کے خود سلطنت چھوڑ کر عزلت گزیں ہو گیا۔ ناصر کے عہد میں روما کے پوپ انوسان سوم نے تمام یورپ کو مسلمانوں کے خلاف بھارا۔ متعدد شاہان یورپ اس کی وجہ سے متحد ہو کر حملہ آور ہوئے۔ ناصر ایک لشکر کثیر لیکر ان کے مقابلہ کے لیے گیا۔ لیکن اہل فوج کے دل چونکہ باہم متحد نہ تھے اس لیے ہزیمت ہوئی۔ اور اسی شکست سے اندلس میں اسلامی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ جنگ جیان کے شمال میں ۱۵ صفر ۶۰۹ھ میں ہوئی تھی۔

منتصر ناصر کے قلب پر اس شکست کا بڑا اثر پڑا۔ اور ۶۱۰ھ میں اس نے اپنے بیٹے یوسف منتصر کو اپنا جانشین بنا کر گوشہ نشینی اختیار کر لی منتصر کے زمانہ میں مسلمانوں کے بہت سے شہروں اور قلعوں پر عیسائیوں کا تسلط ہو گیا۔

بنی احمر اِدھر دشمن ایک ایک شہر پر قبضہ کرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور اِدھر مشرقی اندلس میں محمد بن یوسف اور بنی ھود میں جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اور عجیب ترامر یہ تھا کہ محمد بن یوسف اس امید پر کہ اسپانی عیسائی میری امداد کریں ان کی حمایت میں مصروف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ۶۳۳ھ میں قرطبہ پر پھر ۶۴۶ھ میں اشبیلیہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شلب۔ طلبیرہ اور مرسیہ بھی ۶۵۹ھ میں لے لیا۔ اور مسلمانوں کے پاس صرف ساحل بحر کا حصہ رہگیا جس کا عرض ایک مرحلہ سے زیادہ نہ تھا۔ اس کا صدر مقام غرناطہ تھا۔ محمد بن یوسف اور اس کے بعد اس کی اولاد جو بنی احمر کہی جاتی ہے اسی رقبہ کی مالک رہی۔ اور اس میں بھی تنازع باہمی قائم تھا۔ جب غفلت سے کسی قدر ہوش آیا اور دیکھا کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں ہماری ہستی عنقریب مٹ جائیگی تو بنی حرب سے جو مراقش میں حکمراں تھے مدد کے طالب ہوئے۔ اُنھوں نے کبھی کبھی تھوڑی امداد بھی کی لیکن اب ان میں اصلاح کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی آخر کار شاہ فرڈیننڈ وادی آش پر قبضہ کر کے غرناطہ کی طرف آیا۔ اور وہاں کے امیر کو ایک رقم کثیر دیکر یہ چاہا کہ وہ مصالحت کرے۔ اس نے مشورہ لیا۔ اہل غرناطہ اسپر رضامند نہ ہوئے۔ فرڈیننڈ محاصرہ کیا مسلمانوں نے سات مہینہ کے بعد مجبور ہو کر صلح کی صلحنامہ میں مسلمانوں کے موافق تمام شرطیں رکھی گئی۔ مثلاً ہر چھوٹے بڑے کو امان ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے گھر میں اور اپنی اپنی جائداد پر قابض رہے کسی کی ملکیت ضبط نہیں کی جائے گی۔ شریعت اسلام کا احترام رکھا جائے گا۔ مسجدیں نہیں گرائی جائیں گی۔ مسلمانوں پر یہودی اور نصرانی حکومت کے لیے نہیں متعین کیے جائیں گے۔ ان کے

مقدمات انہیں کی شرلعیت کی رو سے فیصل ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس صلحنامہ کے بعد غرناطہ کے آخری امیر ابو عبداللہ نے اپنی مسند حکومت چھوڑ دی۔ اور اندلس سے اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ عیسائیوں نے جو شرطیں کی تھیں ان کو ایک ایک کر کے توڑنا شروع کر دیا۔ اور مسلمانوں کے اوپر ہر طرح کی سختیاں کرنے لگے اور ایسے ایسے دردناک مظالم ان پر توڑے جن کے لکھنے سے قلم لرزتا ہے۔ مسلمان اکثر افریقہ میں چلے آئے بقیہ وہیں ہلاک یا عیسائی ہو گئے۔ اور ایک زبردست شاندار اسلامی سلطنت جو صدیوں یورپ میں سربلند بلکہ اس کا تاج بنی رہی ایسی ہو گئی کہ اس میں کسی مسلمان کا نشان نہیں رہا۔

یہ سب کچھ ان خود غرض ناعاقبت اندیش اور بدبخت امراء کے اعمال کا نتیجہ تھا جو اپنی ذاتی منفعت کے آگے امت کی مصلحت کو نظر انداز کرتے تھے۔ نہ ان کو اسلام کی حمایت کا خیال تھا نہ اللہ کا خوف تھا۔ صرف اپنے لذائذ دنیوی اور جاہ و دولت کی خاطر باہم لڑتے تھے اور تفریق اور نفاق پھیلاتے تھے۔ جس سے خود بھی تباہ ہوئے اور قوم کو بھی برباد کیا۔

کارل مارکس اور نظام اشتراکی

جس طرح کہ علم المعیشت کو اٹھارہویں صدی عیسوی کی ایجاد کہا جاتا ہی حالانکہ فن معیشت Economic کے وجود کا پتہ اس زمانہ قدیم کی تاریخ سے ملتا ہی جب کہ انسان کی ضروریات زندگی نہایت قلیل تہیں اور وہ تہذیب و تمدن سے بالکل ابتدائی دور میں تھا بعینہ اسی طرح نظام اشتراکی کو اٹھارہویں صدی کے چند گمراہ فلسفیوں کے تخیل دماغی سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ واقعہ یہ ہی کہ یہ کشمکش اسی وقت سے موجود ہی جب سے دنیا میں تفریق مراتب کی ترویج ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کہ اس مذہب کے موئدین کی بڑی تعداد اس زمانہ میں پیدا ہوئی جب کہ یورپ میں ایک عظیم الشان معاشی انقلاب واقع ہو رہا تھا اور اس ترقی کا لازمی و ناگزیر نتیجہ سرمایہ داروں اور عمال کی وہ کشمکش تھی جو ہمارے زمانہ میں ظہور پذیر ہو رہی ہی۔

عہد جدید جس کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس سے شمار کیا جاتا ہی، آزادی و مساوات اور عام بیداری کے لحاظ سے یہ زمانہ خاص طور پر ممتاز ہی۔ اسی زمانہ میں آئینی اور نیابتی حکومتوں کی بنیاد پڑی اور سلطنت کے نظم و نسق میں عوام بھی ایک حد تک شریک ہونے لگے۔ سب لوگوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا۔ گویا کہ حریت و آزادی کی ایک لہر فضائے عالم میں دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی گوناگوں انکشافات و ایجادات کی وجہ سے ایک عظیم الشان معاشی انقلاب پیدا ہوا اور لوگوں کی طرز زندگی میں ایک نمایاں فرق بہ نسبت پیشتر کے نمودار ہوا۔ ان تمام واقعات کا اثر یہ ہوا اور اقتضا بھی یہی تھا کہ ایک عالمگیر تحریک پیدا ہو جو عوام کو طبقۂ خواص کی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکے۔ چنانچہ یہ تحریک پیدا ہو کر رہی اور اس نے مختلف صورتیں اختیار

کرنی شروع کیں۔ ایک عرصہ تک جیسا کہ دُنیا کی ہر بڑی تحریک کا خاصہ ہے اس تحریک کا منشا صرف یہ قرار دیا گیا کہ لوگوں کے جذبات مشتعل کیے جائیں اور جب موقع ملے علَم بغاوت بلند کیا جاوے۔

اسی زمانہ میں کرل مارکس جرمنی میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سال پیدائش ۱۸۱۸ء ہے یعنی یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی اپنی متحدہ کوشش سے صنعت و حرفت کے میدان میں دیگر اقوام عالم سے پیش پیش ہونا چاہتا تھا۔ مارکس نے اسی صنعتی فضا میں تربیت حاصل کی۔ غریب مزدوروں کی حالتِ زار کو دیکھ کر متاسف ہوا کرتا تھا۔ آخر کار اس نے ان غریبوں کو سرمایہ داروں کے بے پناہ ظلم سے نجات دلانا اپنا مقصد حیات قرار دیا۔ برلن یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ایک اخبار کا ایڈیٹر ہو گیا جس کی پالیسی بہ نسبت اور اخباروں کے زیادہ حریت نواز تھی لیکن جب بھی اپنے خیالات کو اس سے بہت زیادہ بلند پاتے ہوئے دیکھ کر اس سے علٰحدگی اختیار کی اور پیرس کے ایک اخبار کی ایڈیٹری قبول کی جسکی پالیسی نظام اشتراکی کی حمایت میں تھی۔ وہاں معلوم ہوا کہ براسلس (بلجیم) میں اشتراکیین کی ایک سوسائٹی ہے۔ فوراً پیرس سے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچکر ایک اخبار کی ادارت اپنے ذمہ لی۔ گویا کہ اسوقت وہ ایک سوسائٹی کے لیڈر کی حیثیت رکھتا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں فرانس کے انقلاب کا اثر جرمنی پر بھی پڑا اور وہاں بھی علَم بغاوت بلند کر دیا گیا۔ مارکس اسی زمانہ میں فوراً جرمنی پہنچا اور مسلح مدافعت شروع کی۔ غرضکہ گرفتار ہوا اور ہمیشہ کے لیے جلاوطنی کا حکم ملا۔ فرانس پہونچا وہاں بھی ایک خطرناک آدمی خیال کیا گیا اور حکم ملا کہ اگر فرانس میں رہنا چاہتے ہو تو گاؤں میں رہو اور کسی بڑے صنعتی شہر میں داخلہ کی اجازت نہیں۔ آخر کار مارکس نے فرانس کو خود خیرباد کہا اور انگلستان کو ملجا و ماوا قرار دیا۔ آخر عمر تک یہیں مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم کار رہا۔ اسی زمانہ میں اس نے "انجمن بین الاقوامی

برائے اتحاد مزدوران "قایم کی اور کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں کتاب اصل Capital کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۸۸۳ء میں شہر لندن میں اس کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا اگرچہ اس کی دُنیاوی زندگی ختم ہو چکی لیکن اس کی تصانیف نے مردہ قوم میں جن کو اپنے حقوق کا مطلقاً احساس نہیں تھا ایک زندگی پیدا کر دی۔ بڑے بڑے انقلابات پیدا ہوئے اور جب سے برابر اشتراکیین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نظام اشتراکی کے موئیدین کتاب اصل کو دنیا کی ان چند مقدس کتابوں میں سے خیال کرتے ہیں جنھوں نے لاکھوں نفوس انسانیہ کے مسئلہ حیات و ممات کو اپنے قبضہ و تصرف میں کر لیا ہے۔ اس کتاب میں معاشی معاملات پر بحث کرنے کے علاوہ اس میں اخلاقیات کا ایک بڑا جزو بھی شامل ہے۔ طرز تحریر اس قدر مدلل اور پر اثر ہے کہ ایک انسانی دل کے لیے ناممکن ہے کہ مظلوموں کی حالت زار اور ان روح فرسا حالات کی تصویر پیش کی جائے جو صنعتی ترقی کا جزو لاینفک ہیں اور اس کو روحانی تکلیف نہ محسوس ہو۔

مارکس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف انقلاب پسند نہیں ہے بلکہ ایک مصلح کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تصویر کے صرف ایک رخ کو پیش نہیں کرتا بلکہ تخریب کے ساتھ تعمیر کی بھی جا بجا تاکید کی ہے اور ہر جگہ انتہا گزینی سے پرہیز کرنے کی ہدایت۔ جب وہ موجودہ سوسائٹی کے نقائص اور خرابیاں بیان کرتا ہے تو ساتھ ہی ان اصولوں کی پابندی شرط قرار دیتا ہے جن پر از سر نو سوسائٹی کی بنیاد رکھی جاوے۔ اگر وہ انقلاب کے علاوہ موجودہ حالات بدلنے کی اور کوئی تدبیر نہیں دیکھتا اور مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت درست کرنے کی اور کوئی صورت اسکو نظر نہیں آتی تو وہ انقلاب کی تشریح بھی کرتا ہے کہ انقلاب سے کیا مطلب ہے؟ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "انقلاب کوئی علحدہ چیز نہیں بلکہ دراصل ارتقا کا ایک مظہر ہے اور قانون فطرت کے تابع"۔ اس کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا انقلاب نہیں ہوا جس کے جراثیم لوگوں میں پیشتر سے پرورش نہ پاتے رہے ہوں

ارتقا اور انقلاب کی مثال ایسی ہی جیسے آگ ایک عرصہ تک سلگتی رہتی ہی اور آخر کار بھڑک اٹھتی ہی۔ اس نے اپنی تحریک کی بنیاد بجائے اپنی تخیلات کے قوانین فطرت پر رکھی۔ اس سے قبل اشتراکیئیں کے اصول میں "خفیہ سازشیں" کرنا بھی شامل تھا چنانچہ وہ ان تمام حرکات کو مذموم خیال کرتا ہی بلکہ اس نے اپنا اصول ظاہرہ تبلیغ واشاعت قرار دیا ہی وہ اگر ایک بات کو حق خیال کرتا ہی تو اس کی دعوت وتبلیغ اپنا فرض عین تصور کرتا ہی۔

اس کی تعلیمات سے صاف عیاں ہی کہ وہ صرف انقلاب پسند ہی نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت مصلح کی بھی تھی جو سوسائٹی کو خرابیوں اور نقائص سے پاک کرنا چاہتا تھا اور اس کا مقصد تھا کہ دنیا پھر امن وراحت کی زندگی حاصل کرسکے جس کے لیے وہ مضطرباً مختلف ذرائع اختیار کررہی ہی۔

اس عالمگیر انقلاب پیدا کرنے کے اس نے دو اصول قرار دیئے اور ان سب کے حاصل کرنے کے دو ذریعے ہیں۔

وہ اصول یہ ہیں:- (۱) موجودہ سوسائٹی کو برباد کرکے تقسیم دولت میں مساوات پیدا کی جائے۔

(۲) ملکیت انفرادی کو مطلقاً نیست ونابود کردیا جائے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیئے انجمن بین الاقوامی برائے اتحاد مزدوران اور فرقہ جنگی (class war) یہ دو ذرایع عمل میں لائے جائیں۔

ملکیت انفرادی کو فنا کرنے سے اس کا یہ مقصد ہی کہ گورنمنٹ بذات خود دولت کی پیدائیش وتقسیم کی ذمہ داری اپنے اوپر لے یعنی عاملین پیدائیش سرکاری ملک قرار پائیں اور ان کی آمدنی چونکہ عام معاشی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہی اور کوئی شخص کل سوسائٹی کی مدد کے بغیر کوئی چیز نہیں پیدا کرسکتا اور جب اس کی آمدنی تمام سوسائٹی کی مدد

سے حاصل کی جاتی ہی تو کیا وجہ ہی کہ اس دولت کا وہ شخص تنہا مالک ہو۔

دوسرا تقسیم دولت کا بڑا نقص یہ ہی کہ لوگ بلا محنت و مشقت دولت کے مالک بن جاتے ہیں اور اس سے مزید آمدنی حاصل کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ایک مختصر جماعت کے پاس تو کافی دولت جمع ہو جاتی ہی اور ایک بڑی تعداد نان شبینہ کو بھی محتاج رہتی ہی حالانکہ عام مرفہ الحالی اور خوشحالی سے یہ مراد ہی کہ تقسیم دولت مناسب ہو مثلاً امریکہ کو جہاں کم اور زیادہ آمدنی کا تناسب ایک اور دس کا ہی زیادہ خوشحال کہا جاوے گا بہ مقابلہ ہندوستان کے جہاں بدقسمتی سے تناسب ایک اور چھ سو کا ہی۔

آمدنی کے غیر مکتسب ذرائع کو مطلقاً برباد کر کے ہر شخص کو مجبور کیا جاوے گا کہ اپنی روزی اپنے قوت بازو سے پیدا کرے۔ اس طرح قدرتاً ایک مساوات پیدا ہو جائیگی اور اگر کچھ فرق رہے گا تو وہ کام کی نوعیت کے اعتبار سے یقیناً فرق تو ضرور قائم رہے گا لیکن فرق متناسب نہ اسقدر کہ ایک شخص تو چین کوے اور دوسرا فاقہ اور اس غریب کی اجرت زندگی کی مایحتاج کے بمشکل برابر ہو۔

مارکس کے اس اصول پر یہ عام اعتراض کیا جاتا ہی کہ "ملکیت انفرادی کے مٹنے سے لوگوں کے کاروبار میں تقابل و تخارف باقی نہیں رہے گا یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہی اور ترقی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نہایت ضروری"۔ اس میں انکار کی گنجائش نہیں کہ تقابل و تخارف فطرت انسانی کا خاصہ ہی لیکن اسی وقت تک جائز قرار دیا جاسکتا ہی جب تک کہ افراد کے مشاغل عامۃ الناس اور جمہور کے نقصان کے درپے نہوں۔ غیر ترقی یافتہ ممالک کی معاشی حالت موجودہ زمانہ کے تقابل تخارف کی بیّن مثال ہی۔ ایک ملک کی صنائع کو برباد کرنا اور ہمیشہ کے لیے ان پر معاشی تحکم قائم کرنا آجکل کی تہذیب کا ایک جزو ہی۔ اس زمانہ میں "سیاسی تحکم" سے ایک قوم کو نجات مل سکتی ہی لیکن معاشی غلامی کہیں زیادہ ذلیل و رسوا کرنے والی ہی۔

غرض کہ مارکس کے ان اصول نے تمام عالم میں ایک عجیب کشمکش برپا کر دی ہے۔ ہر طرف سرمایہ دار اور مزدور دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ فطرت کے اس انقلاب کا مقصود مظلوموں کی دادرسی معلوم ہوتا ہے۔ مادیت اور سرمایہ داری چونکہ دونو اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے ہیں اس لیے اب ان کا انحطاط ضروری اور لابدی امر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نظام تمدن کی بنیاد بجائے کشمکش و مقابلہ کے ارتباط و التفات پر قائم ہوگی اور دنیا میں تصادم و تضارب کی بجائے صلح و طمانیت کا جھنڈا لہرائے گا۔

اس تحریک کی روزافزوں ترقی کی زندہ مثالیں جرمنی اور روس موجود ہیں۔ ان دونوں ممالک میں مارکس کی تعلیم کے موئیدین برسر حکومت ہیں۔ ان لوگوں کا منشا صرف اس مسلک کو قبول کر لینا اور اپنی ہستی قائم رکھنا ہی نہیں ہے بلکہ تمام دنیا میں اپنے مذہب اشتراک کی نشر و اشاعت کرنا ہے۔ اب چونکہ بجائے معاشی ہونے کے اس تحریک پر گہرا سیاسی رنگ چڑھ گیا ہے اس لیے موجودہ سیاسیات عالم میں اس تحریک کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

مارکس کا قول ہے کہ اگر انتہا کرینی سے پرہیز کیا گیا تو یہ تحریک تمام کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی یقیناً وہ زمانہ بعید نہیں کہ سب لوگوں میں اپنے حقوق کا قوی احساس پیدا ہو۔ تمام دنیا میں امن و امان کی حکومت قائم ہو اور کائنات کا وہ دور شروع ہو جس کی ہم سب تمنا کرتے ہیں لیکن ابھی ہماری آنکھوں سے مخفی ہے۔

ع - محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

خاقانی اور اُس کا کلام

خاقانی خدائے قصائد تھا، اس نے وہ طرزِ دلفریب ایجاد کی جس کی پیروی کسی سے نہ ہوسکی اور کوئی اس کی تتبع نہ کرسکا۔ اس جگہ ہم صرف یہ دکھائیں گے کہ قصائد میں اس کا درجہ کس قدر اعلیٰ وارفع ہے اور اس کا مرتبہ کس قدر بلند ہے کہ شاعروں کی بلند سے بلند پرواز بھی اس کے عنقائے خیال کو نہیں پاسکتی اور وہ اپنے ملک سخن پر بلاشرکت غیرے حکومت کرتا ہے۔

قصیدہ شجرِ شاعری کا اولین کونپل ہے۔ مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں۔

"جس زمانہ میں شاعری کا آغاز ہوا، عرب کی شاعری مدحیہ قصائد پر محدود تھی، اس لئے ایرانی شعرائے بھی انہی کی تقلید کی تھی۔ اسکے ساتھ صلہ و انعام کی توقع صرف قصیدے سے ہوسکتی تھی۔ یہ اسباب تھے، کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی سے ابتدا کی"

یہ طفل نوزائیدہ رفتہ رفتہ سن شعور کو پہونچنے لگا۔ اس نے قدما کے گھر میں ہوش سنبھالا متوسطین کے عہد میں عالم شباب کا مزہ لوٹا اور متاخرین نے اسے آخری منزل تک پہونچا دیا۔ خاقانی کا زمانہ عہد شباب ہے۔ اس نے اس نوجوان کے سر پر بلند خیالی کا تاج رکھا، دقیقہ رسی کی عینک لگائی، پرشکوہ الفاظ کا جامہ پہنایا، بلاغت کا عطر اور فصاحت کا غازہ ملا اور اثر کی تلوار کمر سے باندھی، پھر کون تھا جو اس کو دیکھتا اور محو تماشہ نہ ہوجاتا اور پھر وہ کون ساوجود عالم تھا جو اس کی ہمسری کرسکتا۔ خاقانی کے تجربہ کار ہاتوں نے اس کے حسن عالم افروز کو اس قدر بڑھادیا کہ آنکھیں آج تک خیرہ ہیں۔

عرب میں مدحیہ قصائد کا یہ انداز تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے جن کو تشبیب کہتے ہیں۔ پھر کسی تقریب سے ممدوح کا ذکر کرتے تھے اس کو اصطلاح میں تخلص یا گریز کہتے ہیں، پھر مدح ہوتی تھی اور دعا پر خاتمہ ہوتا تھا۔ فارسی نے بھی سراپا اسی کی تقلید کی۔ قصیدہ کے حسن کا معیار تین چیزیں سمجھی جاتی ہیں:-

(۱) مطلع، یعنی قصیدہ کا پہلا شعر کس شان کا ہے۔

(۲) تخلص، یعنی ممدوح کا ذکر کس طرح بظاہر بلاقصد آگیا ہے کہ گویا بات میں بات

پیدا ہو گئی ہے۔

(۳) مقطع، یعنی خاتمہ کس عمدگی سے کیا ہے۔

یہی تینوں چیزیں فارسی میں بھی قصیدہ کا معیار کمال قرار پائیں اور ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان تینوں چیزوں کو ہمارا بلند خیال شاعر کس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے لیکن قبل اس کے کہ ہم خاقانی کے محاسن و کمال کا بیان کریں، ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ عمارت قصائد کی خاقانی کے عہد میں کہاں تک تکمیل ہوئی تاکہ پتہ چل سکے کہ صناع بے نظیر اور معمار بے مثال نے اس کی نقاشی و تعمیر میں کیا کچھ کمال دکھایا ہے۔

قدما کے زمانہ کی حسب ذیل خصوصیات ہیں :۔

(۱) تکلف، مبالغہ اور آورد نہ تھی۔ سادہ اور صاف خیالات کو سادہ لفظوں میں ادا کرتے تھے۔

(۲) زیادہ تر الفاظ کی صنعت گری پر مدار تھا جس کی متعدد صورتیں تھیں۔

(الف) ایک مصرعہ میں جو الفاظ آتے تھے دوسرے مصرعہ میں اکثر انھیں کے مرادف الفاظ لاتے تھے۔

(ب) اس سے بڑھکر یہ کہ ہموزن بلکہ ہم قافیہ الفاظ لاتے تھے۔

(ج) امیر معزی اور عبدالواسع جبلی اکثر قصیدوں میں لف و نشر کا التزام کرتے ہیں اور بعض قصیدوں میں اس کے ساتھ صنعت اعداد بھی شامل کرتے ہیں۔

اس قسم کی شاعری پر سب سے پہلے انوری نے دست اصلاح بڑھایا اور شوکت الفاظ کی جگہ مضمون آفرینی پر توجہ کی۔ اس کے بعد ظہیر فاریابی جسے کمال علوم درسیہ کی وجہ سے "صدرالحکماء" (بقول ید بیضا) کا لقب قوم کی زبان سے ملا تھا۔ دقت آفرینی اور مضمون بندی کا آغاز کیا۔ متوسطین اور متاخرین کی دقیق خیال بندیاں اُسی کے نمونہ پر قائم ہوئیں۔ اس کی خصوصیات شاعری یہ ہیں :۔

(۱) دقت آفرینی اور خیال بندی کی بنیاد قائم کی۔
(۲) ترکیب بندش میں چستی، بلندی اور زور پیدا کیا۔
(۳) زبان میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پیدا کی۔

عالم قصائد کا یہی عالم تھا کہ یک بہ یک خاقانی کے اختراعات و لفریب اصطلاحات دلاویز سے ملک سخن میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا اور ظہیر و انوری کی لکیریں اس کی رنگ آمیزی سے مجسمۂ کمال صناعی بن گئیں اور لوگوں کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔

خاقانی ایسے وقت میں پیدا ہوا تھا جبکہ قدما کا دور ختم ہو چکا تھا اور متوسطین کا آغاز عہد تھا۔ اس لیے یہ بیجا نہ ہو گا اگر کہا جائے کہ خاقانی وہ نسبت و واسطہ ہے جو ان دونوں دور کو ملاتا ہے اور ایک ایسی بنیاد قائم کر دیتا ہے جس پر تمام آنے والے شعرا اپنی عمارت کی تعمیر کریں گے۔

شاعری جذبات قلبی کے اظہار کا نام ہے اور واردات دلی کا سچا اظہار اصلی شاعری ہے، چنانچہ خاقانی کا یہ خاص کمال ہے کہ وہ اپنے معاصرین کے خلاف جن کے یہاں اظہار واقعہ کی بو بھی نہیں آتی، واقعہ نگاری کی طرف مائل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام باوجود اشکال مختلفہ اس قدر موثر، مرغوب اور پسند خلائق ہے۔ اس نے اکثر قصیدے خاص خاص واقعات پر لکھے ہیں اور ان قصائد میں جہاں واقعات کی تصویر کھینچی ہے، شاعرانہ تخیل کا رنگ بھی چڑھایا ہے۔ جس سے کلام میں تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حج کے لیے جاتا ہے اور تمام منازل و مراحل کو اس قدر خوبی سے بیان کرتا ہے کہ بس پورا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اس پر شاعرانہ رنگ آمیزی اثر کو اور بڑھا دیتی ہے اور پڑھنے والا اپنے کو کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے۔ چنانچہ اس بارے میں اس کے اکثر قصائد ہیں جن میں نہزۃ الارواح اور تحفۃ العراقین زبان شہرت کے انتہائی زینہ پر ہیں اور وہ اس مزے سے تمام مدارج کو بیان کرتا ہے کہ پڑھیے اور لطف اندوز ہو جیسے مطلع نہزۃ الارواح کا ملاحظہ ہو:-

شبے واں از صبحِ صادق کعبۂ جاں دیدہ اند
صبح را چوں محرمانِ کعبۂ عریاں دیدہ اند

حاجی جس جوش و خروش سے اس رکن مذہبی کو ادا کرتے ہیں اور جو جذبات ان کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں، ان کی بالکل صحیح تصویر اس نے اس طرح کھینچی ہے۔

شبے واں چوں رخِ صبح آئینہ سیما بینند
کعبہ را چہرہ دراں آئینہ پیدا بینند
گرچہ زاں آئینہ خاتون عرب را نگرند
در پسِ آئینہ رومی زنِ رعنا بینند

اور اسی طرح تمام واقعات کو اس جوشِ عقیدت سے لکھتا ہے کہ بس پڑھیے اور مزا لیجیے۔

اس کے بعد حج سے واپسی میں مدائن کی طرف سے گزرتا ہے۔ وہاں کے بوسیدہ کھنڈر اس کی گزشتہ عظمت یاد دلاتے ہیں اور یہ خیال کر کے کہ

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

وہ بہت متاثر ہوتا ہے اور اس واقعہ عبرت انگیز کو یوں ادا کرتا ہے۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نگہ کن ہاں
ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں
گویند کہ تو خاکی خاکِ تو ایم اکنوں
گامے دو سہ بر مانہ اشکے دو سہ ہم بفشاں
از نوحہ جغد۔ الحق مائیم بہ درد سر
از دیدہ گلابے کن درد سرِ ما بنشاں

ما بارگہ دادیم، ایں رفت ستم بر ما
بر قصر ستمگاراں ایا چہ رود خذلاں

کون سا ایسا سخت دل ہوگا جو اس کو پڑھنے کے بعد اشک عبرت نہ بہائے۔
حج سے واپس آکر جب قید ہو جاتا ہے۔ اُس وقت زنداں میں جو قصیدے اس نے
اپنے بارے میں لکھے ہیں، ان سے ایک معصوم قیدی کی سچی حالت، اہل زنداں کا تشدد،
دشمنوں کی ریشہ دوانیاں، مجلس کے مناظر دردناک سب کا سماں ہمارے سامنے ہوتا
ہے اور کوئی بغیر اثر نہیں رہ سکتا۔ ہائے کس حسرت سے اس کی ابتدا کرتا ہے:۔

صبحدم چوں کلہ بند د آہ دود آسائے من
چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمائے من
مجلس غم ساخت است و من چو بید سوختہ
تا بمن راوق کند مژگان مے پالائے من

دوسرے قصیدہ میں اس قید سے آزادی کے لیے یوں دعا کرتا ہے۔

یارب از یں جلسگاہ یاز رہانش کہ ہست
شردان شر البلاد، خصمان شر الدواب
زیں گرہ نا حفاظ، حافظ جانش تو باش
کز تو دعائے غریب زود تو د مستجاب

ان سچے جذبات قلبی کے بعد اس میں مناظر قدرت کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور
دیکھنا چاہیے کہ اس میدان میں ان کا کیا حال ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ صحیح اور سچے طور سے
مناظر قدرت کا نقشہ کھینچتا ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ بہار کی آمد ہے، سبزہ کچھ کچھ اُگا ہے
ابھی ابر برس کے کھل گیا ہے۔ یہاں وہاں سیلاب آب نے عجیب کیفیت پیدا کی ہے۔
اسے وہ یوں ادا کرتا ہے:۔

رخش سیہ را بتاخت بر سر خضر آفتاب

رفت بحرب اخری گنج رواں در رکاب

کحلی چرخ از سحاب گشت مسلسل بہ شکل

عودی خاک از نبات گشت مسلسل بتاب

درد ی مطبوخ بیں بر سر سبزہ زبیل

شیشۂ نارنج بیں بر سر آب از حباب

ظہیر نے بھی بہار کی تعریف میں ایک پر زور قصیدہ لکھا ہی جس کا ایک شعر یہ ہی:۔

چمن ہنوز لب از شیر ابر نا شستہ

چوں شاہداں خط سبزش دمیدہ گرد عذار

صبح کا سین کھینچنے میں ان کو دکھانا ہی کہ ابھی صبح کاذب نمودار ہوئی ہی۔ اسے وہ کسقدر خوبصورتی سے ادا کرتا ہی:۔

زد نفس سر بمہر صبح ملمع نقاب　　خیمہ رومانیاں گشت معنبر طناب

اب صبح کاذب کے بعد نور سحر کی آمد کو اس خاص انداز سے بیان کرتا ہی:۔

صبح بر آمد کوزہ چوں مہ نسختنب زچاہ　　مہر بر آمد ز صبح چوں دم ماہی ز آب

اس کے بعد آفتاب طلوع ہوتا ہی اور چاند اس کی تاب نہ لا کر روپوش ہو جاتا ہی:۔

نیزۂ کشید آفتاب حلقۂ مہ در ربود　　نیزۂ ایں زر سرخ حلقہ آں سیم ناب

رات کے سین کو اس طرح پیش کرتا ہی:۔

ماہِ نو دیدی حمائل ز آسماں انگیختہ　　اختراں تعویذ سیمیں بیکراں انگیختہ

جذبات فطرت و مناظر قدرت کی سچی ترجمانی اسی کا نام ہی اور تم دیکھ رہے ہو کہ اس کام کو اس نے کس خوبصورتی سے انجام دیا ہی۔

اب ہمیں خاقانی کی دوسری خصوصیت کی طرف توجہ کرنی چاہیے اس میں سب سے

بڑی بات یہ ہے کہ وہ نہایت کثرت سے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات و تلمیحات لاتا ہے۔ جب تک کوئی شخص ان تمام علوم و فنون سے واقف نہ ہو، اس کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

دلِ من پیر تعلیم است و من طفل زباندانش
دم تسلیم سرِ عشر و خم زانو دبستانش

اس قصیدہ میں جس کا یہ شعر ہے، صدہا علمی تلمیحات ہیں جن سے علما کے سوا عام لوگ بہت کم واقف ہو سکتے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ کئی کئی سو اشعار کے قصیدے لکھتا ہے اور کہیں زور طبیعت کم نہیں ہوتا۔ مشکل اور دشوار گزار ردیفوں میں قصیدے لکھے لیکن اس کی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اور اس خاص صنعت میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ البتہ حضرات امیر خسرو اس کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ تین خصوصیات خاقانی کی تھیں لیکن ہمیں جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، قصیدہ کو اس کے مطلع، تخلص اور مقطع سے انداز کرنا چاہیے۔ اس میں بھی ہم دیکھیں گے کہ وہ کسقدر کامیاب ہے۔ اپنے مربی و آقا فخرالدین منوچہر و خاقان الاعظم کی مدح میں لکھتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:۔

پیش کہ صبح بردرد شقہ چتر عنبری ‎ ‎ ‎ خیز نگر بہ برق مے برقع صبح برد ری

سبحان اللہ! کس قدر پر زور مطلع لکھا ہے۔ اب گریز کی مثال ملاحظہ ہو۔ اس نے آنحضرت صلعم کی نعت لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ موسم بہار ہے، ابر برس کے کھل گیا ہے، روز روزِ عید اور رات شب برات ہے، تمام طیور نغمہ سرائی کے لیے باغ میں جمع ہوتے ہیں، ان میں سے ہر اپنے مطلوب کو ایک دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ آخر میں فیصلہ تاجورِ طیور عنقا پر چھوڑا جاتا ہے وہ فیصلہ کرتے ہوئے گلاب کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ وہ رسول اللہ

کے پسینہ سے پیدا ہوا اور پھر وہ رسول کیسا ہی؟ آپ کی تعریف شروع کر دیتا ہی، گویا
بات میں بات پیدا ہو گئی ہی۔ چنانچہ گریز کا شعر ملاحظہ ہو:۔

گرچہ ہمہ دلکش انداز ہمہ گل مغز تر   کو عرق مصطفےٰ ست دیں دگر از خاک و آب

اپنے مربی کی تعریف میں اس نے ایک قصیدہ لکھا ہی جس میں خاتمہ کس عمدگی سے کیا ہی۔
کہتا ہی:۔

بادت جلال و مرتبہ چندانکہ آسماں   ہر صبحدم برآورد از حنا در آئینہ
حاسد ز دولت تو گرفتار آں مرض   کز می کنند برائے وے آہنگر آئینہ

کس خوبصورتی اور زور کے ساتھ اس نے قصیدہ کو ختم کیا ہی، اس کو صرف اہل سخن
حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں۔

رہا اب خاقانی کے ظاہری محاسن اشعار، وہ تشبیہات و استعارات نہایت
کثرت سے استعمال کرتا ہی اور بعض وقت بڑی دور کی نسبت سے اس استعارے کو لاتا ہی
اس نے کہا ہی کہ آفتاب اپنے نیزۂ شعاع سے گوئے مہ کو لے گیا۔
رعایت لفظی کی اکثر مثالیں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ دو تین الفاظ کے پھیر سے ایسی خوبصورتی
اور ایسے معنی پیدا کر دیتا ہی کہ بس جی خوش ہو جاتا ہی۔

اس چھوٹے سے مضمون میں ہم نے یہ دکھلانے کی کوشش کی ہی کہ ملک قصائد
کا شہنشاہ اپنے ہر اسلحہ کے استعمال میں کس قدر کمال رکھتا ہی۔ جذبات فطرت، مناظر قدرت
زور بیان، موثر پیرایہ، پرجوش طریقہ اظہار، رعایت لفظی، کمالات فصاحت و
بلاغت سب کے سب اس کے خزانہ کے انمول جواہر ہیں۔ واقعہ یہ ہی کہ آنچہ
خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔

فلسفۂ لغت

علم اللسان عربوں کی ایجاد بتایا جائے تو لوگوں کو حیرت ہو گی، لیکن عربی صرف و نحو لغت اور قرآن و احادیث کی تفسیروں پر نکتہ رس نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت کھل جائیگی کہ اس فن کا سنگ بنیاد عرب میں رکھا گیا۔

مسلمانوں نے قرآن فہمی کے لیے جو فنون ایجاد کیے ان میں سے ایک کا نام اشتقاق ہے۔ یہ فن ان تغیرات اور تصرفات سے بحث کرتا ہے جو کسی عربی لفظ میں پیدا ہو کر نئے معانی کا اضافہ یا کچھ قیود کی کمی کر دیتے ہیں۔

علمائے اشتقاق نے اس فن کو تین شاخوں میں تقسیم کیا ہے (۱) اشتقاق صغیر یا صرف (۲) اشتقاق کبیر (۳) اشتقاق اکبر

(۱) صرف کا موضوع بحث تو صرف وہ تغیرات ہیں جو ایک ترتیب حروف کے الفاظ میں پیدا ہو کر چند قیود معنوی کا اضافہ یا کمی کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب کسی مادہ کے پہلے حرف کے بعد 'الف' ہو اور اس کے بعد کا حرف مکسور ہو تو وہ لفظ ایسے شخص پر دلالت کرے گا جس کی طرف اس مادہ کے معنی کا صدور بتایا جائے۔ چنانچہ طَلَب = مانگنا، طالب = مانگنے والا۔ قتل = مار ڈالنا، قاتل = مار ڈالنے والا۔

(۲) اشتقاق کبیر ایک مادہ اور اس کے ترتیبی انقلابات سے بحث کرتا ہے۔ مثلاً 'ق، ف، ل' جس ترتیب سے بھی جمع ہوں، جدائی و فرق یا قرب و انضمام پر دلالت کریں گے۔ چنانچہ فَلَق = پھاڑنا، لفق = پھٹی ہوئی چیز کو جوڑنا، قَفَل = جا کر واپس آنا۔

(۳) اشتقاق اکبر کا میدان بہت وسیع ہے، اس فن کو **فلسفۂ لغت** کہنا چاہیے۔ یہ فن چند قسم کے حروف کے اجتماع اور ان کے فوائد و نتائج سے بحث کرتا ہے۔ یہ بحث اس قدر وسیع ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں صورت و شکل یا

فلاں قسم کی آواز کے الفاظ فلاں معانی پر کیوں دلالت کرتے ہیں؟ فلاں لفظ اور فلاں لفظ میں کیا فرق ہے؟ اور کیوں؟

فن اشتقاق اگر کسی عہد میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ ہمارے بعض علما کو دعوی تھا وہ ہر لفظ کی وجہ دلالت بیان کر سکتے ہیں۔ ایک معتزلی عالم فرماتے ہیں کہ تمام الفاظ اور ان کے معانی کے درمیان ایک طبعی مناسبت ہوتی ہے۔ اس فن میں کبھی کافی کتابیں موجود تھیں اور اس فن کے مسائل کچھ اس قدر عام تھے کہ قرآن و حدیث کی تفسیروں میں اکثر ان مسائل کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ بخاری کی حدیث بدء الوحی میں ایک جگہ 'فصم' کا لفظ آیا ہے۔ علامہ عینی اس لفظ کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"چونکہ 'ف' ایک رخوہ (نرم) اور مہموسہ (پست آواز) حرف ہے اس لیے اشتقاق والوں نے بتایا کہ 'فصم' کے معنی ہیں اس طرح کاٹنا کہ جدائی پیدا نہ ہو اور چونکہ 'ق' ایک شدیدہ (سخت، بلند قلقلہ والا حرف ہے اس لیے 'قصم' کے معنی ہیں کاٹ کر الگ کر دینا۔"

اس عبارت کو نقل کر دینے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اندازہ کرے کہ یہ فن کس قدر ترقی کر چکا تھا۔ صرف ایک حرف کے تغیر سے جو معنوی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کو بھی ایک شخص نہایت آسانی سے جان سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری بدبختیوں نے اس فن کو ناپید کر دیا۔

فن اشتقاق کے تمام مسائل بیان کرنا ہمارا مقصود نہیں بلکہ بطور مشتے نمونہ از خروارے چند مثالیں دی جاتی ہیں جن سے مقصد صرف اس قدر ہے کہ ذہین طبیعتیں اس مسئلہ پر پھر سے غور کرنا شروع کر دیں تاکہ مٹا ہوا فن دوبارہ زندہ ہو جائے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حیوان ناطق (بولتا جانور) صرف انسان ہے لیکن اشتقاق نے بتایا کہ ہر جانور حیوان ناطق ہے اور ہر جانور کے پاس احساسات ہیں جن کو وہ اپنی فطری آواز ہی کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ انسان کے احساسات چونکہ بہت وسیع ہیں، اس لیے اس کی آوازیں بھی مختلف ہیں اور ان آوازوں کو مختلف طریقوں سے ترتیب دے کر طرح طرح کے معانی پیدا کر سکتا ہے۔

کیا تم نے کبھی سوچا کہ انسان کو پہلے پہل بولنا کیونکر آیا ہوگا۔ ایک مولوی تو کہدیگا کہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے بولنا سکھایا)، لیکن ایک فلسفی پوچھے گا کہ وہ طریقۂ تعلیم کیا تھا؟ —— اس میں شبہ نہیں کہ انسان کا پہلا معلم فطرت ہے، لہذا بولنا بھی سب سے پہلے فطرت نے سکھایا۔ انسان کے تمام الفاظ اس کی فطرت محاکات کے نتائج ہیں۔ کاٹنے کو کاٹنا کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ جب ایک سخت چیز ایک سخت چیز پر پڑتی ہے تو کٹ کی آواز پیدا ہوتی ہے اور بسا اوقات اس آواز کے ساتھ وہ چیز ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے یہاں اگر ہمارا اشتقاق بتائے گا کہ جب کوئی حرف سنی شدید (دانت سے پیدا ہونے والا سخت حرف) کسی دوسرے اسی قسم کے حرف کے ساتھ ملے گا تو عموماً اس کی آواز اُس آواز سے مشابہ ہوگی جو کسی سخت چیز کے سخت چیز پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے اس بنا پر ہر وہ لفظ جس کا پہلا حرف 'ق' یا 'ک' ہو اور دوسرا حرف 'ت'، 'ط'، 'د' ہو تو اس لفظ کے معنی میں سختی ضرور پائی جائے گی خواہ وہ سخت آواز پر دلالت کرے یا کٹنے، کاٹنے، توڑنے، ٹھونکنے، ریزہ ریزہ کرنے یا اس قسم کے دوسرے معنی پر دلالت کرے مثلاً قطّ (کاٹ دینا)، قدّ (پھاڑنا)، قطع (کاٹنا)، قطل (کھجور وغیرہ کاٹنا)، قتل (آدمی کا کاٹنا)، قدر (اصلی معنی اندازہ کر کے الگ کر دینا)، قطب (لکڑی کا کاٹنا)۔ ان الفاظ پر غور کیجیے۔ تمام الفاظ کسی نہ کسی چیز کے کاٹنے پر دلالت کرتے ہیں۔ 'ط' کی آواز میں چونکہ زیادہ ضغطہ (رکاوٹ) پایا جاتا ہے اور 'د' میں کم، اس لیے قطّ کے معنی کاٹ کر الگ کر دینے کے ہیں اور 'قدّ' کے معنی پھاڑنے کے ہیں۔

ایک حرف دوسرے سے بدل بھی جاتا ہے۔ 'ق' کو اگر 'خ' سے بدل دو تو چونکہ موخر الذکر 'ق' سے کم سخت ہے، لہذا معنی میں بھی کم سختی پائی جائے گی۔ مثلاً قاطع (کاٹنے والا)، اخدود (گڑھا)۔ غور کرو دونوں کے معنی میں بھی وہی فرق ہے جو دونوں لفظوں میں ہے۔ دوسرے حرف یعنی 'ت'۔ 'ط'۔ 'د'، کو لیجیے اور کسی حرف سنی رخوہ (دانت سے

نکلنے والا نرم حرف) سے بدل دیجیے تو اس کے معنی بھی کاٹنے کے ہوں گے لیکن چونکہ آواز ذرا کم سخت ہوگی اس لیے معنی میں بھی کم سختی ہوگی مثلاً قص (پر یا بال کاٹنا) اور قصل (کسی نرم درخت کا کاٹنا)۔ قضم (ہڈی چبانا) اور قشم (کری چبانا)۔ قصم (توڑ کر الگ کر دینا)۔ اور قسم (بانٹنا) قس علیٰ ہذا

مندرجہ بالا مثالوں سے تم نے دو نتائج اخذ کیے ہوں گے، پہلا یہ کہ انسان کے بہت سے الفاظ اس کی فطرت محاکات کے نتائج ہیں۔ ایک آواز سنی، اس کی نقل کرنا شروع کر دیا، پھر رفتہ رفتہ اس قسم کے اور نتائج، اسباب، اشباہ اور متعلقات کے لیے استعمال کرنے لگا۔

دوسری بات یہ اخذ ہوئی ہوگی کہ ایک حرف کے اوصاف کا اثر اس کے معنی پر بھی پڑتا ہے یہی نہیں کہ شدت و رخاوت ہی موثر ہو بلکہ اطباق (حرف کا اس طرح نکلنا کہ زبان تالو سے لپٹ جائے)، انفتاح (زبان کا تالو سے الگ رہنا) وغیرہ اوصاف بھی اثر ڈالتے ہیں۔ دیکھیے 'ص' اور 'س' رخاوت کے اعتبار سے برابر ہیں لیکن چونکہ اول الذکر میں اطباق ہے اس لیے 'قصم' کے معنی کسی جڑی ہوئی چیز کو توڑ دینا اور چونکہ 'س' میں اطباق نہیں ہے اس لیے 'قسم' کے معنی محض ایک چیز کے کئی حصے ظاہر کر دینا۔

انسان کے تمام الفاظ صرف اس کی فطرت محاکات کے نتائج نہیں بلکہ بعض الفاظ ان فطری آوازوں سے پیدا ہوئے ہیں جو کسی خاص جذبہ یا شدید احساس کے ساتھ خودبخود پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے اشتقاق اکبر حروف کی پیدائش، ان کی صوتی کیفیات اور ان خاص باتوں سے بھی بحث کرتا ہے جس سے کوئی حرف پیدا ہوتا ہے اس کے بعد وہ حروف کے اجتماع سے جو خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے، اس پر غور کرتا ہے کہ وہ انسان کی کس فطری آواز کے مشابہ ہے۔ اس کے بعد وہ بتائے گا کہ اس قسم کے الفاظ فلاں معنی پر دلالت کرتے ہیں اور اس دلالت کی یہ وجہ ہے۔

آواز کیا چیز ہی؟ جب کسی جانور یا انسان پر کوئی شدید احساس طاری ہوتا ہی تو اس کے اندرونی رگ و ریشے میں ایک طرح کا تموج پیدا ہوتا ہی اور اس تموج کی وجہ پھیپھڑے کی ہوا حلق سے لیکر ہونٹ تک چند مقامات سے ٹکراتی ہوئی نکلتی ہی، اس ٹکرانے سے جو ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہی اسی کو لفظ یا آواز کہتے ہیں۔ جس وقت یہ آواز بغیر تصنع کسی انسان یا جانور سے یکبارگی نکل جاتی ہی تو بے غور و فکر ایک دوسرا شخص نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہی کہ بولنے والا کس قسم کے احساس سے متاثر ہو کر یہ آواز نکال رہا ہی؟ تم غافل بیٹھے ہو، ایک شخص پیچھے سے ایک سوئی چبھو دیتا ہی، یقین جانو کہ اگر تم غافل ہو تو کوئی نہ کوئی صفیر (سیٹی) جیسی آواز تمھارے منہ سے پیدا ہو گی تم بیٹھے ہو، سامنے سے ایک بدبودار چیز گزری، یقیناً اس غفلت کی حالت میں غنہ آمیز صفیر تمھاری ناک سے پیدا ہوگی۔ کوئی تم کو مار بیٹھے، بیساختہ آہ نکلے گی۔

پس معلوم ہوا کہ تمھارے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو فطرتاً پیدا ہو جاتے ہیں اور ان الفاظ سے بھی اشتقاق کا سلسلہ چلا ہی۔ تم کوئی چیز سونگھو گے تو "شوں" یعنی غنہ آمیز صفیر جیسی آواز ضرور پیدا ہوگی۔ اب غور کرو۔ "شَمّ" (سونگھنا)۔ "اُسُون" (پانی کا بدبودار ہونا)۔ "خَزَنَ" (گوشت کا بدبودار ہونا)۔ یہاں پر علم الاشتقاق بتاتا ہی کہ جتنے الفاظ صفیر غنہ یا اور کسی حرف حلقی سے مرکب ہوں گے۔ خوشبو، بدبو، انقباض نفس، انبساط طبع، یا ناک سے تعلق رکھنے والے معانی پر دلالت کریں گے۔ مثلاً حَسَن (خوبصورتی)، شناعت (برائی)، ....، ضَنَع (خوشبو)، فیحٌ (گرم ہوا)

الغرض اشتقاق اکبر اس بات پر غور کرتا ہی کہ انسان کی فطری آوازیں کیا ہیں اور کن مواقع پر پیدا ہوتی ہیں؟ اور ان آوازوں سے کس طرح کتنے الفاظ اور پیدا ہوئے۔ نیز الفاظ کی ساخت اور بناوٹ کے لحاظ سے وہ غور کرتا ہی کہ یہ لفظ کس قسم

کی آواز سے مشابہ ہو اور اس مشابہت کی وجہ سے اُس کو کس مفہوم پر دلالت کرنا چاہیے
اشتقاق اکبر کی بحث یہیں نہیں ختم ہوتی۔ وہ الفاظ کی تاریخ پر بھی غور کرتا ہو اور سوچتا ہو کہ یہ لفظ اپنے معنی سے ہٹکر دوسرے معنی پر کیوں کر دلالت کرنے لگا۔ تم نے 'ابن' اور 'بنا'، دونوں لفظ سُنے ہوں گے۔ کیا ان دونوں لفظوں میں کوئی قرابت تم کو نظر آتی ہو؟ شاید تم یہ نہ بتا سکو۔ مجھ سے سنو۔ 'ب'، 'ن'، اور حرف علت، جب ایکجا جمع ہوں تو قرب یا بُعد پر دلالت کریں گے مثلاً بَین (فاصلہ) بَون (دوری)، نَوب (قائم مقام ہونا) 'نَوب' اور 'بَون' میں وہی فرق ہو جو 'بُعد' اور 'بَعد' میں ہو۔ اس اصول پر 'ب۔ ن۔ ی' کو بھی بُعد یا قرب پر دلالت کرنا چاہیے تھا لیکن 'بنا' کے معنی 'مکان بنانا'، اور 'ابن' کے معنی (جو اصل میں 'بنو' تھا) بیٹے کے ہیں۔ بات یہ ہو کہ یہ مادہ اصل میں زناشوئی پر دلالت کرتا ہو، 'ابن' اسی کا نتیجہ ہو۔ اور 'بنا' کی وجہ اشتقاق یہ ہو کہ عرب میں یہ دستور تھا کہ شادی کے بعد زناشوئی کے لیے ایک خاص تاریخ مقرر ہوتی تھی اور ایک خیمہ ڈالا جاتا تھا اور اسی خیمہ کے اندر یہ رسم ادا ہوتی۔ اہل عرب بولنے لگے فُلَانٌ بَنیٰ عَلَیْھَا۔ رفتہ رفتہ اسی سے 'بنا'، مکان بنانے کے معنی میں مستعمل ہو گیا۔

غرض اشتقاق اکبر کا مقصد یہ ہو کہ وہ زبان کی پیدائش، اس کے فطری اور غیر فطری تغیرات اور ان امور سے بحث کرے جن سے نفس زبان کی ماہیت ظاہر ہو۔ اگرچہ یہ فن تقریباً معدوم ہو چکا ہو لیکن اس کے جستہ جستہ مسائل مختلف کتابوں میں اب بھی موجود ہیں اگر ان کو یکجا کیا جائے اور پھر سے غور کیا جائے تو بہت کچھ کامیابی کی امید ہو۔ میں نے اس مضمون پر دو سال تک برابر غور کیا ہو اور خدا کے فضل و کرم سے کافی الفاظ کے متعلق اصول قائم کر لیے ہیں اور مختلف قواعد منضبط بھی ہو چکے ہیں مگر تحریک ترک موالات نے تقریباً ۲۰ ماہ سے ان اصول کو مرتب صورت میں جمع کرنے کی اجازت نہ دی اور کاغذات نذر طاق ہو رہے ہیں۔

سید جمال الدین افغانی

ہیرو آف پان اسلامزم

سید جمال الدین ۱۸۳۸ء میں ایران کے ایک موضع اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن اُنھوں نے اپنے کو افغانی اس وجہ سے منسوب کیا تاکہ وہ افغانستان کے شہری بنکر ایک آزاد اہل سنت کی زندگی بسر کر سکیں اور ایرانی حکومت کی حفاظت سے سبکدوش رہیں۔ ان کے باپ نہایت غریب اور ان پڑھ تھے۔ سید جمال الدین ابھی بچہ ہی تھے کہ ان کے والد منتقل ہو کر کابل چلے گئے۔ بچپن ہی سے سید موصوف بہت ذہین اور ذکی الفہم تھے۔ اپنی عمر کے دسویں برس تک اُنھوں نے ایک مقامی اسکول میں تعلیم پائی۔ بعد کے دس سال میں اُنھوں نے تمام علوم اسلامی، عربی صرف و نحو، علم السنہ، تاریخ، دینیات، تصوف، منطق، فلسفہ، طبعیات، ریاضی، نجوم، طب وغیرہ حاصل کیے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور کچھ اوپر ایک سال رہے۔ اس عرصہ میں اُنھوں نے مغربی علوم کا مطالعہ کیا۔ وہ ایشیائی زبانوں کے علاوہ فرانسیسی سے بھی واقف تھے ہندوستان سے بعزم حج وہ مکہ گئے اور وہاں سے افغانستان کو لوٹے۔

اس عرصہ میں افغانستان میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور جب محمد اعظم برسر حکومت ہوئے تو اُنھوں نے سید جمال الدین کو اپنا وزیر بنایا لیکن شیر علی نے انگریزوں کی مدد سے محمد اعظم کو شکست دی اور موخر الذکر بچ کر ایران چلے گئے پھر بھی سید موصوف کابل ہی میں رہے اور شیر علی کے انتقام سے محفوظ رہے۔ لیکن اُنھوں نے افغانستان میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور حج کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے کو تو مل گئی لیکن شرط یہ تھی کہ ایران سے ہو کر نہ جائیں، کیونکہ محمد اعظم سے مل جانے کا اندیشہ تھا چنانچہ وہ ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کے راستہ سے مکہ کو روانہ ہوئے۔ یہاں حکومت ہند کی

طرف سے ان کا خیر مقدم کیا گیا لیکن مسلمان لیڈروں سے ملاقات کرنے سے ان کو باز رکھا گیا اور ایک ماہ بعد گورنمنٹ نے خود انھیں اپنے ایک جہاز پر سویز بھیجا۔ وہاں سے وہ قاہرہ چلے گئے اور چالیس دن تک وہیں قیام کیا۔ اس مدت میں ان کی آمد و رفت جامعہ ازہر میں برابر جاری تھی، اکثر طلبا اور اساتذہ سے گفتگو ہوتی اور وہ اپنے قیامگاہ پر چند منتخب طلبا کو لکچر دیا کرتے تھے۔

مکہ جانے کی بجائے سید جمال الدین قسطنطنیہ چلے گئے جہاں سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم نیز دیگر امراء سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ۱۸۷۰ء میں دار الفنون (یونیورسٹی) کے ڈائرکٹر نے طلبا کے سامنے لکچر دینے کے لیے انھیں دعوت دی۔ تقریر ترکی زبان میں تھی اور خاص و عام میں بہت مقبول ہوئی۔ افسوس یہ ہے کہ ان کا روز افزوں اثر دیکھ کر شیخ الاسلام کے دل میں ان کی طرف سے حسد پیدا ہوا اور وہ اس تاک میں تھے کہ کہیں گرفت کا موقع ملے۔ سید موصوف نے اپنی تقریر میں رعایا کو ایک زندہ جسم سے تشبیہ دی جس کے مختلف اعضا ملک کی مختلف پیشہ ور جماعتیں تھیں اور بادشاہ بمنزلہ دماغ ہے آہنگر بمقابلہ بازو کاشتکار بجائے دل اور جہاز راں بمنزلہ پاؤں ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "انسانی جماعت اسی طرح پر مشتمل ہے۔ لیکن جسم بغیر روح کے بیکار ہے اور اس جسم کی روح یا تو پیغمبرانہ قوت ہے یا فلسفیانہ، گو یہ دونوں باہم مختلف ہیں۔ اول الذکر بخشش الہٰی ہے اور موخر الذکر غور و مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ان دونوں میں ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور فلسفی غلطی کر سکتا ہے" آخر کار شیخ الاسلام کی چل ہی گئی اور انھوں نے یہ الزام لگایا کہ سید موصوف نے رسالت کو "پیشہ" یا "حرفہ" بتایا ہے اور رسول کو پیشہ ور۔ ہر چند سید جمال الدین نے اپنی مدافعت میں دلائل سے کام لیا اور اس ایجیٹیشن کو روکنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی ترکی حکومت نے امن و امان کے خیال سے قسطنطنیہ چھوڑنے کا حکم دیدیا وہاں سے وہ ۱۸۷۱ء میں مصر آئے۔

سید جمال الدین کا اصلی ارادہ کچھ عرصہ تک مصر میں رہنے کا تھا۔ طلبا اور دوسرے لوگ جو اُن کی شہرت سن چکے تھے، جوق در جوق ان کے پاس آتے اور تقریر کی فرمائش کرتے چنانچہ سید موصوف نے دینیات، فلسفہ، قانون، ہیئت اور تصوف پر متعدد لیکچر دیے ان کا اثر اور شہرہ دن بدن مصر میں بڑھتا رہا اور اُنھوں نے اپنی تمامتر توجہ اس پر صرف کی کہ طلبا میں تحریر کی قوت پیدا ہو۔ چنانچہ علمی، مذہبی، سیاسی اور فلسفیانہ مضامین لکھنے کی انھیں ترغیب دلائی۔ سید موصوف کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ ملک میں بہت سے نوجوان لکھنے والے پیدا ہو گئے۔ یہاں بھی ان کے اعدا نے انھیں چین نہ لینے دیا۔ پرانے مولویوں نے ان پر اعتراضات شروع کر دیے، دوسری طرف انگریزی قونصل جنرل نے توفیق پاشا خدیوِ مصر سے کہہ کر ۱۸۷۹ء میں ان کا اخراج کرا دیا۔ سید جمال الدین پھر ہندوستان میں آئے اور حیدر آباد (دکن) میں مقیم رہے۔

۱۸۸۲ء میں "نوجوان مصری" کی تحریک شروع ہوئی جس کے بانی خود سید جمال الدین تھے۔ قوم پرستوں اور حکومت کے درمیان جنگ ہونے سے قبل انھیں حیدر آباد سے کلکتہ بلایا گیا اور اُس وقت تک نظر بند رکھا گیا جب تک مصری قوم پرستوں کو شکست نہ ہوئی۔ ہندوستان سے روانہ ہو کر وہ سب سے پہلے لندن آئے اور چند روز بعد پیرس چلے گئے جہاں تین سال تک قیام کیا۔ یہاں ان کے دوست اور شاگرد رشید محمد عبدہ مفتی مصر سے ملاقات ہو گئی اور دونوں نے ملکر ایک عربی ہفتہ وار اخبار "العروۃ الوثقیٰ" نکالا جو بالکل سیاسی اور انگریزوں کا قطعی مخالف تھا۔ حکومت برطانیہ نے اس کے روزافزوں اثر کو دیکھ کر اور اپنے لیے مار آستین سمجھ کر سب سے پہلے ہندوستان میں اس کا داخلہ بند کر دیا اور آخر میں غالباً خارجی ذرائع سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اخبار بند ہونے کے بعد سید موصوف ماسکو اور سینٹ پیٹرسبرگ تشریف لے گئے جہاں ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ اپنے قیام کے زمانہ میں اُنھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا

کہ زار سے کہہ کر قرآن شریف اور دیگر مذہبی تصانیف کے طبع کی اجازت دلائی۔ اسی زمانہ میں شاہ ایران نے آکر ان سے ملاقات کی اور بعد اصرار و انکار انھیں لوا گئے اور وزیر اعظم کے عہدہ پر رکھا۔ اتفاق سے دونوں میں باہم کشیدگی پیدا ہو گئی اور شاہ ایران نے انھیں نکلوا دیا جس پر ان کے معتقدین میں سے ایک نے شاہ موصوف کو قتل کر ڈالا۔ ۱۸۹۲ء میں لندن ہوتے ہوئے وہ قسطنطنیہ آئے اور زندگی کے آخری ایام یہیں گزارے۔ سلطان عبدالحمید انھیں بہت عزیز رکھتے تھے اور جب شاہ ایران کے قتل پر ایرانی حکومت نے ان کا مطالبہ کیا تو سلطان نے صاف انکار کر دیا بالآخر سید موصوف نے قسطنطنیہ میں انتقال کیا۔ بیاں کیا جاتا ہے کہ ایرانیوں نے سازش کر کے انہیں زہر آلود خلال دیدی تھی۔
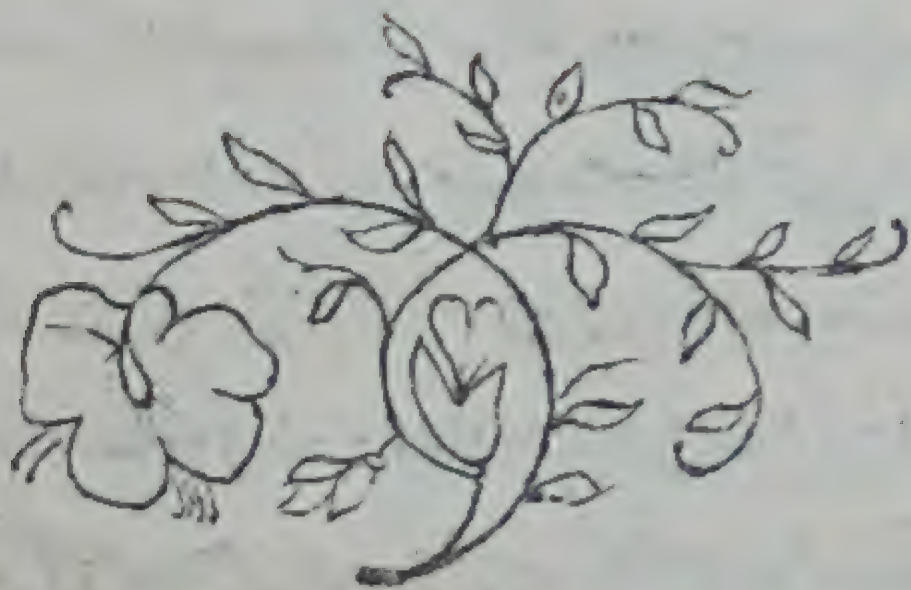
جوان بیمار

"آہ! گردش ایام اور انقلاب زمانہ بھی کیا چیز ہی۔ تمھارے والد بزرگوار میرے بچپن کے دوست تھے اور ہم دونو بیروت کے طبیہ کالج میں ساتھ پڑھتے تھے مگر اُنھوں نے تکمیل سے پہلے کالج کو خیرباد کہا جب سے نہ میں نے انھیں دیکھا اور نہ ان کی کوئی خبر ملی" ڈاکٹر..... نے کہا

نوجوان کی آنکھوں میں بے اختیارانہ آنسو اُمنڈ آئے۔ اس نے بچشم نم جواب دیا" ہاں! والد مرحوم کا اسی وقت انتقال ہوگیا جب میں نے اپنی زندگی کے پہلے سال میں قدم رکھا تھا۔ کل شام کو میں اپنی والدہ کے کمرہ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک تصویر ہی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ بہت غور سے اس تصویر کو دیکھ رہی ہیں۔ میں دروازہ پر ٹھہر گیا اور کسی طرح اندر جانے کو جی نہ چاہا۔ میں اس طرح کھڑا تھا جس طرح وہ بیٹا جو اپنی ماں کے اسرار دروں سے مطلع نہ ہونا چاہتا ہو مگر وہ فوراً چونک کر میری طرف متوجہ ہوئیں اور کہنے لگیں:۔

"فواد! کیوں کیا چاہتے ہو؟"

میں نے نہایت خفیف آواز سے پوچھا" اماں جان! یہ آپ کے ہاتھ میں کس کی تصویر ہی؟"

اماں:۔ بیٹے یہ تصویر تمھارے ابا جان کی ہی۔

میں آگے بڑھکر غور سے اُسے دیکھنے لگا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میرے ہی زمانہ پیری کی تصویر ہی۔ ہاں میں نے لوگوں سے سُنا ہی کہ میں اپنے والد مرحوم سے بہت مشابہ ہوں مگر اماں جان اس سے انکار کرتی ہیں انھوں نے میرے کمرہ کی دیوار میں ایک تصویر آویزاں کردی ہی جس سے صحت و تندرستی اور شباب و نشاط کے آثار نمایاں ہیں۔

اماں جان مجھ سے کہتی تھیں کہ یہ تمھارے باپ کی تصویر ہے۔ پھر میں نے ان کے ہاتھ سے تصویر لے لی اور کہا "اماں جان یہ کیسی تصویر ہے؟ یہ تو اس تصویر سے بالکل نہیں ملتی جو میرے کمرہ میں آپ نے آویزاں کی ہے" اماں جان نے مجھے اس طرح دیکھا کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور کہا "یہ تصویر تمھارے ابا جان نے اپنی وفات سے چند روز پہلے کھچوائی تھی اور تمھارے پاس جو تصویر ہے وہ زمانۂ شباب و تندرستی کی ہے"

مجھے اپنی ماں کے اس قول میں کچھ شک ہوا اور میں سمجھ گیا کہ ضرور ان کا سینہ کسی ایسے راز کا حامل ہے جو مجھ سے چھپانا چاہتی ہیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر یہ دل نہ چاہا کہ اپنے سوالات سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگاؤں۔

مگر اب آپ جب تک اپنے دوست کے تمام تر حالات نہ بتا دیں، میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔

گزشتہ ہفتے میں بہت زیادہ اس جستجو میں رہا کہ اپنے والد کے کسی ایسے دوست سے ملوں جس سے مرحوم کے مفصل حالات معلوم ہو سکیں اور جن کے خلوص و صداقت پر مجھے اعتماد ہو۔ مجھے اپنی ماں سے پوچھنے کی اس وجہ سے جرات نہیں ہوتی کہ ان کے خیالات ادھر متوجہ نہ ہو جائیں۔ آخر کار مجھے ڈاکٹر . . . کا خیال آیا۔ وہ ڈاکٹر جن کا میں بہت زیادہ ادب و احترام کرتا ہوں، ان کا خیال آتے ہی یہ بھی یاد آ گیا کہ والدہ نے ایک بار ذکر کیا تھا کہ ڈاکٹر . . . تمھارے باپ کے قدیم دوست ہیں۔ ایک روز علی الصباح میں ان کے مطب میں گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت جوش و مسرت کے ساتھ ملے۔ مجھے ان کے اخلاق نے بہت جلد ان سے مانوس کر دیا۔ ڈاکٹر . . . . نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں بیٹھ گیا اور دیر تک ان کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر جرات کر کے کہا:۔

"والد مرحوم کے جو کچھ حالات آپ کو معلوم ہیں وہ میں آپ سے سننا چاہتا ہوں میری موجودہ عمر نے ہر چیز معلوم کرنے کا مجھے اہل بنا دیا ہے مگر اپنی ماں سے پوچھنا نہیں

چاہتا کیونکہ میں جانتا ہوں اس قصے کو چھیڑنا بہت سی ایسی باتیں یاد دلاتا ہے جو ان کے دل کو پاش پاش اور ان کے جگر کو مجروح کر دیں گی۔ میں بہت خیال رکھتا ہوں کہ ان کے جذبات و احساسات کے نازک شیشہ میں ٹھیس نہ لگنے پائے۔ لہذا جناب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ وہ سب حالات سنائیے جن کے بیان کی تلخی میری والدہ کے لیے فراق شوہر کی تلخیوں سے کم نہیں ہے۔ آپ کو خدا کی قسم، والد مرحوم کی جو کچھ تاریخ حیات آپ جانتے ہیں، اس کا اعادہ فرمائیے اور اس کا خفیف سے خفیف جزو بھی مجھ سے نہ چھپائیے۔ آپ جانتے ہیں، دنیا میں اپنے باپ کے سوانح حیات معلوم کرنے کا بیٹے سے زیادہ کس کو اشتیاق ہو سکتا ہے“۔

ڈاکٹر۔۔۔ نہایت شریف الاخلاق، پاک طینت عالی ظرف آدمی تھے، انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہرہ پر سحاب غم چھا گیا تھا پھر فرمایا۔ ”عزیز من! تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟ تمھارے والد مرحوم سے میری پہلی ملاقات طبیہ کالج (بیروت) کے ابتدائی درجہ میں ہوئی تھی۔ اسی وقت سے وہ میرے دوست ہو گئے اور ہم دونوں میں رشتہ ارتباط قائم ہو گیا۔ مرحوم کالج میں ایک نیک مزاج اور ہر دلعزیز متعلم تھے۔

آیندہ سال کے اوائل ہی میں میں نے محسوس کیا کہ تمھارے والد کی طبیعت میں خلاف امید تغیر ہو گیا ہے۔ کالج ہستے، وہ بالکل بددل ہو گئے ہیں اور اپنے سبقوں کی وہ بالکل پروا نہیں کرتے۔ ان کی تمام تر ذہانت بدشوقی سے بدل گئی ہے۔ وہ کالج کے اوقات میں عاشقانہ ناولوں کے مطالعہ میں مصروف رہنے لگے اور کالج سے غیر متعلق مباحث کے سوا ان کو کسی چیز سے کام نہ تھا۔ یہ شکایت اکثر لوگوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے۔ کہ اپنی قوت دماغی کو ایک وسیع سطح پر پھیلا کر اس کے اثر کو کمزور کر دیتے ہیں۔ ایک روز میں نے ان کے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ تو انھوں نے

کھول دیا مگر میں نے دیکھا کہ وہ بالکل مبہوت ہو رہے تھے ۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑے اور اپنے پلنگ کے نیچے سے سگرٹ نکالا جسے اس خوف سے چھپا دیا تھا کہ اس وقت آنے والا کالج کا کوئی پروفیسر نہ ہو کیونکہ کالج کے اصول نہایت سختی سے سگرٹ اور سگار کے مخالف ہیں یہ سگرٹ نوشی ہی ان تمام بداطواریوں کا پہلا زینہ ہے جس پر تمھارے والد مرحوم نے قدم رکھا تھا وہ اسی سال ان سے بہت سی ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جو قواعد کالج کے بالکل منافی ہیں ۔ چنانچہ اکثر اوقات وہ رئیس کلیہ (پرنسپل) کی بلا اجازت شہر کو چلے جاتے تھے عزیز من! میں تم سے یہ بھی نہیں چھپانا چاہتا کہ تمھارے باپ اس سال حصول علم کی آڑ میں کھیل کود میں مشغول رہتے تھے اس کا نتیجہ ششماہی امتحان میں ظاہر ہو کر رہا ۔ اس طرح کہ وہ ہندسہ میں فیل ہو گئے اور جو عزت کالج کے طلبا میں انھیں حاصل تھی، اسی نے اب کالج چھوڑنے پر مجبور کیا چنانچہ یہ بات مشہور کر دی گئی کہ اس فیل ہونے کا سبب کالج چھوڑنے کا ارادہ ہے ۔ اس خبر نے ان کے اکثر احباب کلیہ (کالج) کو بہت زیادہ متاثر کیا ۔ تمھارے باپ کالج چھوڑ کر چلدیئے اُنھوں نے اپنی غلطی کا بالکل احساس نہ کیا اور نہ اپنے عزیز وقت کے برباد جانے کا ۔ اسوقت سے جب کبھی وہ ہم لوگوں کو ملجاتے تھے تو ملاقات ہو جاتی تھی، ورنہ نہیں ۔ مگر تمام کالج کو ان کے اس طرح جانے کا افسوس تھا ۔ پھر ایک بار میں نے سنا کہ وہ شعبۂ تجارت میں کسی خدمت پر معمور ہو گئے ہیں مگر یہ خبر بھی صحیح نہ تھی ۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنے چند بدچلن اور کاہل احباب میں وقت ضائع کرنے لگے جو ہر شہر میں اکثر مل جاتے ہیں ۔ کئی مہینے اس طرح گزر گئے کہ میں نے ان کو نہ دیکھا اور کالج کے احباب میں یہ خبر پھیل گئی کہ خلیل کی اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی ہے ۔ وہ لذائذ نفسانی میں گرفتار ہیں اور بادہ نوشی و قمار بازی میں اپنا تمام وقت گزارتے ہیں ۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ وہ مجھے ایک جگہ مل گئے، مختلف امور پر بحث کرتے ہوئے ہم دونوں شارع منارہ پر دور تک چلے گئے ۔

انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ چھپائی۔

میں نے اپنے دوست کی حالت زار پر بہت اظہار افسوس کیا اس لیے کہ میں نے دیکھا کہ جمال اخلاقی اور حسنِ ادب ان سے بالکل جا چکا تھا۔ یہ ایک اصول ہے کہ انسان کا نفس اس کی نگاہوں میں مافی الضمیر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اور اس کی جبین صاف پر اس کے تمام اچھے برے افعال، اوس کی اخلاقی حالت اور رنگ طبیعت کا ایک صحیح نقشہ مرتسم ہو جاتا ہے۔ شریفانہ خیالات اور شریفانہ عادات انسان کے بشرہ پر اس کے اخلاقی محاسن کو اس طرح نمایاں کر دیتے ہیں کہ حسن و جمال ظاہری اُس کے آگے ہیچ ہیں جسمانی خوبی و رنگینی اور دل کش خط و خال کی جاذبیت سب کو محاسن اخلاق کے آگے محجوب ہونا پڑتا ہے۔

میں وہ باتیں کرنا چاہتا تھا، جو میرے دوست کے لیے مفید و کارآمد ہوں لہٰذا میں نے اُسے بتایا کہ ایک شریف نوجوان کے لیے نفسانی خواہشوں کا بندۂ بے دام اور ناجائز آرزوؤں کا اسیر ہو جانا شرمناک بات ہے مگر وہ بالکل خاموش میری باتیں سنتا رہا مرحوم خلیل کا ہاتھ پکڑ کر پھر میں نے اور وضاحت سے کام لیا اور کہا کہ: پیارے دوست! ہم تم دونوں بہارِ زندگی کے عالم میں ہیں بہت سی معاشرتی برائیوں کا انبوہ اور صدہا اخلاقی آفتوں کا زبردست ہجوم ہماری تاک میں ہے۔ پیارے دوست! یاد رکھو بہت سے ناقابل انکار لذائذ ہیں مگر انسان اپنے دورِ شباب میں، افراط و تفریط کی جانب مائل ہو قدرت نے ضمیر اور عقل کے لیے اُن سے بہتر لذائذ پیدا کیے ہیں برائی کا راستہ گویا ایک ایسی نہر ہے کہ جس قدر اپنی اصل جگہ سے دور ہوتی جاتی ہے اسی قدر پھیلتی جاتی ہے پس تم رذائل کا نقشہ اپنی آنکھوں میں مرتسم کر لو اور اس آخری نقطہ پر نظر رکھو جس پر ایک زمانہ دراز کے بعد تم اپنے کو پاؤ گے۔ اصلی مسرت میرے دوست اخلاقی پیکر میں انسان کا ہونا ہے پس تم طبقۂ عالیہ کی کاہلی و آرام طلبی اور طبقۂ ادنیٰ کی جہل و نادانی سے بچو۔

اس میں شک نہیں کہ جن جواہر علوم کو تم نے اپنے دامن میں چن کر رکھا ہے وہ تم کو مناسب

جہالت سے بچا سکیں گے میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تمہیں اس قسم کی کاہلی و رسوائی سے محفوظ رکھے جو انسانی جسموں کو زہر آلود کر دیتی ہیں۔ جس کی بدولت عقلیں کوتاہ اور جذبات مردہ ہو جاتے ہیں جو احساس صحیح کو فنا اور غیرت و حمیت کو بالکل تباہ کر دیتی ہیں مجھے نہایت افسوس ہوگا اگر زمانہ کی تہذیب میں یہ آفت پھیلتے ہوئے دیکھوں گا۔ انسان زمانہ حاضرہ میں قرون گذشتہ کے نتائج طبع کا ایک ثمر ہوتا ہے۔ زمانہ اپنی رفتار پر برابر چلتا اور ہم سے دوسروں کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔

میں یہ تقریر کر رہا تھا اور عزیز من تمہارے باپ میرے برابر چلے جا رہے تھے اُنکی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اُن کی قوت متخیلہ عالم خیال میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ آخر یہ محسوس کر کے کہ وہ میری باتوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ موضوع سخن بدلنا پڑا۔ ہم دونوں کالج کے قریب پہنچ گئے تھے لہٰذا میں نے خلیل کو رخصت کیا اور وہ تنہا شہر کی طرف چل دیے۔

اُس روز رات کو میرا دل کسی طرح سبق میں نہ لگا۔ تمام تر خیالات نوجوان خلیل کی طرف متوجہ تھے اور بار بار دل یہ کہتا تھا کہ اگر وہ بھی کالج نہ چھوڑتا تو آج ڈاکٹری کلاس کے تیسرے سال میں ہوتا۔

پھر ایک سال تک تمہارے مرحوم باپ سے ملاقات نہوئی۔ اسی عرصہ میں میں نے ڈاکٹری کی سند پالی اور اپنا مطب کھول دیا جہاں اس وقت تم بیٹھے ہو۔ طلبیہ کالج کے جب کسی قدیم دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے تو میں بہت مسرور ہوتا ہوں۔ مگر سب سے زیادہ مسرت اس روز ہوئی جب تمہارے والد مرحوم مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میرا دل کثرت شادمانی سے لبریز ہو رہا تھا۔ ہم دونوں مصافحہ کر کے ایک جگہ بیٹھ گئے اور اس گذشتہ زمانہ کی باتیں کرنے لگے جس میں میں اپنے دوست کی زیارت سے اکثر محروم رہا تھا۔ عزیز من تم سے یہ بھی نہ چھپاؤں گا کہ میں نے تمہارے باپ کی صحت

میں تھوڑا سا تغیر پایا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی شیرینی اور گھلاوٹ پیدا تھی جو دعوت شک دیتی تھی اور اس کے چہرہ کی زردی بتاتی تھی کہ صحت اچھی نہیں ہے۔

پھر ایک سال گزر گیا اور میں نے اس دوران میں اُنھیں نہ دیکھا کیونکہ میں کلب اور ہوٹلوں وغیرہ میں بہت کم جاتا تھا۔ آخر موسم بہار میں دوسری ملاقات ہوئی۔ خلیل کی ضعف و نقاہت نے مجھے بہت غمگین بنا دیا گویا وہ قبر سے اُٹھ کر بھاگا ہے۔ ہاتھ پکڑ کر میں نے اُسے بٹھالیا اور کہا:۔

"خلیل یہ کیا ہوگیا کیا تم بیمار ہو۔ اس سے قبل جب تم ملے تھے تو کچھ کچھ ضعف کے آثار تم میں نظر آتے تھے۔ سچ سچ بتاؤ۔ دیکھو مجھ سے کچھ چھپانا نہیں"۔ جواب میں خلیل نے سکوت کیا اور گردن جھکالی۔ آخر میں نے کمرہ میں لے جا کر طبی معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ حقیقت میں وہ بیمار ہے اور مرض اپنا کام کر چکا ہے۔ مجھے خلیل سے بہت محبت تھی کسی طرح یہ جی نہ چاہا کہ معمولی اور غیر مفید دواؤں سے اس کا پیٹ بھر دوں میں اٹھا اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں نے کہا:۔

آؤ خلیل میرے ساتھ پروفیسر . . . صاحب کے پاس چلو وہ بہترین ڈاکٹر ہیں۔ تمھاری بیماری کی نسبت اُن سے مشورہ کرنا بہتر ہوگا۔

میں پروفیسر . . . کے مطب میں پہنچا۔ مرحوم خلیل کا معائنہ کر کے اُنھوں نے بہت افسوس کے ساتھ ظاہر کیا کہ مرض اپنا کام کر چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ تمھارے والد مرحوم کی عیاشانہ زندگی نے اُن کے جسم میں ایسا مرض پیدا کر دیا تھا جس کے علاج سے تمام اطبا، عالم مجبور تھے۔ میں نے تمھارے باپ کو رخصت کیا مگر اُن کی اس دردناک حالت سے بہت متاثر تھا۔ اس وجہ سے اور بھی زیادہ کہ میں نے اپنے کو ان کی خدمت سے مجبور اور اپنے ہاتھوں کو معطل پایا۔ کیونکہ اُن کی جسمانی بیماری انسان کی امکانی طاقتِ مداوا سے بہت بڑھ چکی تھی۔

چند مہینوں کے بعد تمھارے باپ سے پھر ملاقات ہوئی مگر اب ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ خارجی اسباب حقیقتِ حال کی پردہ پوشی کر سکتے میں نے دیکھا کہ وہ بڑے بڑے قدم مارتا ہوا قبر کی طرف جا رہا ہے۔ ہم دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تمھارے باپ نے مجھ سے کہا:۔

عزیز دوست! میں اس تجرّد و تنہائی کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں، گو مجھے شادی کرنے کا خیال نہیں مگر بعض احباب بے حد اصرار کر رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اصرار سے کس طرح نجات پا سکوں گا۔

میں نے صاف طور سے کہہ دیا کہ:۔ شادی کرنا سخت غلطی ہے اس سے زیادہ حماقت ممکن نہیں۔ اس کے بعد طبّی اصول سے دیر تک سمجھاتا رہا کہ تم ہرگز شادی کے قابل نہیں ہو" درحقیقت تمھارے والد کو شادی کا زیادہ خیال نہ تھا مگر بڑا الزام تمھارے نانا کے سر ہے جو اس غریب و بیکس بیوہ کے باپ ہیں جسے تم اپنی ماں کہتے ہو البتہ تمھارے باپ کی یہ سخت غلطی تھی کہ اس معاملہ میں انھوں نے شرم و حجاب اور خاموشی سے کام لیا ان کو اپنی جسمانی حالت کا اظہار ضروری تھا۔ میں تو انہیں شادی نہ کرنے پر مجبور کر چکا تھا مگر تمھارے نانا برابر کوشش کرتے رہے آخر کار راضی کر ہی لیا۔

ایک مقامی اخبار میں جس وقت یہ خبر نظر سے گذری کہ خلیل کی منگنی ہو گئی تو میں حیران رہ گیا اور ان سے مل کر پوچھا کہ یہ کیا حماقت کی مگر وہ ایسے شخص کی طرح خاموش رہے جس کے اعصاب کمزور اور عزم بوسیدہ ہو چکا ہو۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نکاح بھی جلد ہونے والا ہے ایک رات میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تمھاری بیوہ ماں کی بدقسمتی پر افسوس کر رہا تھا اور اپنے جی میں کہہ رہا تھا کہ افسوس میرا دوست ایک افسانۂ غم کا ہیرو ہونے والا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ضرور خدا اور عدالت ضمیر کے سامنے اس نوجوان اور بے گناہ دوشیزہ کی نسبت مجھ سے باز پرس ہوگی اور حقیقتِ حال کے اظہار سے اگر میں خاموش رہا تو یقیناً مجرم ہوں۔ یہ نکاح ایک

پورے خاندان کی بربادی کا باعث ہونے والا ہے۔ میرے نزدیک اپنے عزیز دوست کی جو بہترین خدمت میں کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے معلومات سے لڑکی کے ماں باپ کو مطلع کر دوں۔

میں گاڑی پر سوار ہوا اور چند منٹ کے بعد ہی دروازہ پر تھا۔ اندر گیا تو تمام گھر والے نہایت تپاک سے پیش آئے کیونکہ مجھے اس خاندان سے شرف نیاز حاصل تھا۔ میں نے لڑکی کے ماں باپ سے تنہائی چاہی اور جو کچھ بھی اُن سے کہا بالکل آزادانہ کہا کیونکہ یہ میرا شریفانہ جذبہ تھا اور میں ہرگز شرمندہ نہیں ہوں۔ لڑکی کی ماں خوب کان لگا کر میری باتیں سنتی اور مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ مگر اس کے باپ کی زبان پر جو بھلا یا بُرا آیا سب کہہ ڈالا اور نہایت غیر مہذب الفاظ سے میری توہین کی گئی۔ آخر میں گھر سے باہر نکل آیا یا نکال دیا گیا اُس گھر سے جو میرے ایک عزیز دوست کا گھر تھا۔

جس وقت میں باہر نکلا ہوں تو زور سے دروازہ بند کر لیا گیا۔ میں سڑک پر کھڑا تھا اور رنج و حسرت کے ساتھ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں رو رہا تھا اُس آنے والی مصیبت پر جس کا وقوع میں آنا میرے نزدیک متحقق ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے تمہارے باپ کو مجھ سے بولنے بات کرنے کو بھی منع کر دیا ہے۔ مجھے اپنے عزیز دوست خلیل سے بے حد محبت تھی۔ میں بہت دیر تک رویا کیا۔ جانتا تھا کہ قابل ملامت میرا دوست نہیں بلکہ وہ خاندان ہے جس نے میری نصیحت کی بالکل پروانہ کی اور میرے نیک مشورہ کو ٹھکرا دیا۔

کیا میں نے ان لوگوں سے وہی بات نہ کہی تھی جس پر میرے ضمیر نے مجھے مجبور کیا۔ کیا میں نے اسی حقیقت کا انکشاف نہیں کیا جس کا اظہار میرا ضروری فرض تھا؟ اگرچہ اپنے دوستوں کو دشمن بنا لیا مگر جو کچھ کہا اور کیا اس پر میں شرمندہ نہیں میں ایک بھاری بوجھ سے سبکدوش ہو جانے پر راحت محسوس کرتا ہوں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ تمہارے باپ نے نکاح کر لیا اور ہم دونوں میں جو دوستانہ تعلقات

تھے وہ مرحوم کی زندگی کے آخری مہینے تک منقطع رہے۔ آخر وقت میں مرحوم خلیل کو میرا خلوص اور میرے مخلصانہ نصائح یاد آئے۔ مجھے بلایا جبکہ وہ بستر مرگ پر تھا میں گیا تو اس کو نادم وحسرت زدہ پایا۔ جس وقت اس کی نگاہ تم پر پڑتی تھی تو وہ تمھیں اپنے سینے سے لگا لیتا تھا مگر اس کے بشرے پر ناامیدی و یاس کے سیاہ بادل چھائے تھے میرے رخصت ہونے سے قبل نہایت ضعیف و ناتواں آواز میں کہا:

یہ "درسگاہ کائنات ایک تیز تلوار ہے مگر نہایت شریف بھی ہے۔" یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے مرحوم کے منہ سے سُنے۔ دوسرے دن علی الصباح خلیل نے اس مدرسۂ کائنات کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا۔

یہ ہیں تمھارے باپ کے سوانح حیات اے فواد! جو شروع سے آخر تک میں تم کو سُنا چکا اس سن میں تمھیں حق حاصل تھا کہ اپنے والد کے واقعات زندگی معلوم کرو۔ اور تمھیں بتائے جائیں۔ میں بھی انھیں چھپا کر اپنے ضمیر پر بار گراں رکھنا نہیں چاہتا تھا تمھارے باپ اس وقت تم سے جدا ہوئے جب تم بالکل بچے تھے مگر اب عزیز من! جوان ہو۔ یاد رکھو کہ اپنی ماں کی تمام کائنات اور سرمایۂ زندگی تمھاری ہی ذات ہے اے فواد تم اپنی ماں کے لیے بہترین شریک غم اور وجہ تسلی بن جاؤ۔ لاؤ اپنا ہاتھ بڑھاؤ میں تمھارا ایک مخلص دوست اور باپ بنتا ہوں۔ شکر گزار ہوں گا اگر تم اپنی مشکلات زندگی میں مجھ پر اعتماد اور میرے مفید مشوروں پر عمل کرو گے۔ بس مضبوط عہد کرو اور اپنا دل کڑا کر کے مرد بن جاؤ۔ صاف اور پاکیزہ ہوا کو اپنی ضعف و نقاہت کی دوا سمجھو اور حرارت آفتاب کو رفیق زندگی۔ عزیز من! تمھاری یہ کمزوری موروثی و خلقی ہے اس کے لیے کوئی اور مفید دوا دنیا کے کسی دواخانہ میں نہ ملے گی۔

میں محترم ڈاکٹر کے مطب سے نکلا۔ جان عزیز مجھے ناگوار تھی اور سینہ میں ہجوم آلام یہ تھا کہ غالباً مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میں جو کچھ جانتا ہوں اُسے بتا دینے میں

تم سے تحمل نہ کر دں گا۔ کیونکہ ان کا اپنے سینہ سے نکال دینا ہی میرے لیے وجہ راحت ہے۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ والد مرحوم کے حالات زندگی معلوم کرکے مجھے بہت تسلی وتشفی ہوئی۔ اور اب میں یہ بھی معلوم کرنے کے قابل ہو گیا کہ دنیا میں کسی سے محبت کرنے کے قابل کیوں نہیں ہوں۔ جس طرح میرے اور بہت سے جاننے والے نوجوان ہیں وہ اب میں یہ بھی سمجھ گیا کہ اپنی نازنین ہمسایہ دوشیزہ "میری" کو جب میں نگاہ محبت سے دیکھتا ہوں تو وہ مجھے کیوں بجائے محبت کے رحم وشفقت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ میرا جسم کمزور ہے لیکن اس کی محبت کے لیے میرا دل تمام عشق ومحبت کرنے والے دلوں سے زیادہ مضبوط ہے۔

میں فواد کے سامنے کھڑا تھا اور اس نوجوان بیمار کی حالت زار پر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں تھے۔ اس گفتگو سے میں سیر نہ ہونے پایا تھا کہ وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر چلدیا اور میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ دیکھتے دیکھتے بہت دور نکل گیا اس کے کمزور پاؤں اس کے جسم کا بار نہیں اُٹھا سکتے تھے مگر وہ تیز تیز جا رہا تھا میں اس کے جسم لاغر کو دیکھ رہا تھا اور اس کے نفس حساس پر حیرت کر رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش تمام انسانی قوانین کا مجموعہ میرے ہات میں ہوتا جن کی بنیاد ظلم وستم پر رکھی گئی ہے اور انہیں پارہ پارہ کر دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ ان قوانین میں بہت سے قابل اصلاح نقائص پائے جاتے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ کاش ان میں کسی ایسی دفعہ کا اضافہ کیا جائے جو نوجوان مریضوں اور اُن کے عزم شادی کے درمیان میں ایک مضبوط دیوار کا کام دے سکے جو سختی سے نوجوان مریضوں کی شادی ممنوع قرار دے اور اس وقت تک کسی نوجوان کو نکاح کی اجازت نہ دی جائے جب تک کہ اپنی جسمانی صحت کے متعلق قابل اطمینان طبی سند پیش نہ کرے جو بتاتی ہو کہ اس کا جسم دور تہذیب کے ناپاک جراثیم سے پاک ہے یہ قانون بہت سی

بیگناہ و پاکباز۔ نوجوان و بیکس لڑکیوں کو اپنے بیمار اور چند روزہ مہمان شوہر کے بعد اسفل السافلین میں گرنے سے بچائے۔ اور ایسے مجرم باپوں کو سزا دے جو اپنی بے زبان بیٹیوں کو گھروں میں بار خاطر مہمان سمجھتے ہیں۔ اور جلد سے جلد اُن کے بار سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو یہ سُبکدوشی ان بے زبانوں کو کسی دنیاوی جہنم نگر میں جھونکنے ہی سے کیوں نہ حاصل ہوتی ہو۔

میری دلی تمنا ہے کہ کاش شریف گھرانے اس کو سمجھیں اور ہر خاندان بجائے خود اس اصول کی پابندی کرے۔ تاکہ کسی معتبر اور امین ڈاکٹر کی سند طبی پیش کرنے سے پہلے کوئی نوجوان ہرگز کسی خاندان میں شادی نہ کرنے پائے۔

میں اس نوجوان کے پیکر خیالی کو اپنے سامنے پاتا ہوں اور معلوم ہوتا ہے کہ وہی خطرناک ضعف کا حامل وہی "نوجوانِ بیمار" تمام تر عالم انسانی کو انحطاط نسل اور قلت توالد و انتشار امراض کے خطرہ سے متنبہ کر رہا ہے۔

پھر میں اپنے کمرہ میں گیا تاکہ اس شہید بیگناہ کی داستان غم تحریر کر لوں جس طرح خود اس کی زبان سے سنی ہے۔ اور آج اے اصلاح معاشرت کے حامیو! آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

* * *

احوالِ زنداں

(۱)

انسان کے خیالات میں جلد جلد تبدیلیاں تعجب انگیز ہیں۔ پس اُن خارجی واقعات پر غور کرنا چاہیئے جو اُس کی طبیعت پر اتنا گہرا اثر ڈالتے ہیں کہ محبوب کو مبغوض اور مبغوض کو محبوب بنا دیتے ہیں ایک دن اسکول جاتے وقت چند پا بہ زنجیر لوگوں کو دیکھ کر میں نے یہ پناہ مانگی تھی کہ "ایسی جگہ نہ لے جانا جہاں انسانوں کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا جاتا ہے" لیکن چند سال بعد ۱۹۲۰ء کے اخیر میں جب میں کوٹھی سے کالج جاتا تو جیل خانہ کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتا کہ شاہی درباروں سے تو قوم فروشی کا پتہ ملتا ہے لیکن قوم پرستی کی سند اس کٹہرے میں ہی بند ہو کر حاصل ہوتی ہے لہذا خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس زندانِ محبت میں "جنونِ حق" کے جرم کی بنا پر بند کر دیے گئے ہیں

خدا کی قدرت دیکھیے ایک سال سے کچھ ہی زیادہ عرصہ گزرا ہوگا کہ ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو ۱۱½ بجے میں خود چند احباب کے ساتھ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل کے سامنے اپنے مقدمہ کی سماعت کے لیے کھڑا تھا اور جیل کے پھاٹک پر کندہ کتبہ کو پڑھ کر اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ ہی رہا تھا۔ "دیکھیے سلطان محمد شاہ کے عہد مسعود میں یہ عمارت غربت زدہ مسافروں کے لیے سرائے تھی لیکن اس دور انصاف و تہذیب میں اس کو مادرِ ہند کے سپوتوں کے لیے جیل خانہ بنا دیا گیا ہے۔ نہ معلوم کب تک اس میں رہنا ہو" کہ مجسٹریٹ کے حکم سے دروازہ کھلا۔ ہم سب لوگ داخل ہوئے پولیس کے گواہ بلائے گئے۔ مقدمہ شروع ہوا۔ اور صرف پندرہ منٹ میں ختم ہوا۔ اس لیے کہ گواہوں کو چند تقریریں جس میں ملزم نے اپنے رضاکار ہونے کا اعلان کیا تھا۔ سنانی تھیں۔ نیز ملزم کو نہ گواہوں پر جرح کرنی تھی نہ اپنا بیان دینا مقصود تھا۔ ملزم نے صرف یہ آیہ کریمہ فَلَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا کَبِیْرًا ط تلاوت کی اور چند الفاظ میں اس کا مطلب بیان کرکے اپنی تین ماہ کی سزا کا حکم سنا۔ اختتام مقدمہ پر جیلر آئے اور "پہلے یہاں دوسروں سے ملنے آتے تھے آج خود آگئے" کہکر اس عمارت میں ہم کو داخل کیا جو تین سو سے زیادہ وطن پرستوں کے لیے مجلس بنا دی گئی تھی۔

اندر جاکر اس راہ کے جتنے پیش رو تھے ان سب سے ملا پھر اپنی بارک میں داخل ہوا۔ اندر گھستے ہی معلوم ہوا کہ میرا نام مہمانان شاہی کے رجسٹر میں باقاعدہ درج کر لیا گیا ہے اور اب مجھے ان کے تمام حقوق مل گئے چنانچہ شفیق میزبان کی طرف سے حسب قاعدہ تین کمبل اوڑھنے کے لیے۔ ایک بھٹہ بچھانے کے لیے اور ایک تسلہ اور ایک کٹورا کھانے پینے کے لیے ملا۔ غرض دن انہی نئے انتظامات میں گزر گیا لیکن شام، شب۔ اور صبح اپنی سے ہر ایک اپنی کیفیت خاص رکھتے تھے۔ شام کو غروب آفتاب کا پر کیف بیرونی سماں اور اطمینان ضمیر کی اندرونی حالت کو دیکھتا تھا اور بار بار بیخود دہلوی کا یہ شعر پڑھتا تھا ؎

آنکھ ہے محو تجلی وصل سے دل شاد ہے قید میں بھی طبع بیخود ہر طرح آزاد ہے

سب کو قیدی کی آنکھیں جیل کی دیواریں۔ نیلا آسمان اس کے چمکتے تارے گویا یہ دنیا ہی ایک نئی ہے اور آسمان اور اس کے چمکتے ستارے پہلی بار اصلی حالت میں دیکھے ہیں غرضکہ ایک کیفیت تھی جو دل پر طاری ہوئی۔ جس کو دل محسوس کرتا ہے مگر قلم لکھ نہیں سکتا۔ صبح کو اسی کٹہرہ میں بند تھے۔ چھ بجے تھے کہ میاں حفیظ فرخ آبادی نے اپنی مستانہ وار میں اذان دی اور سونے والی دنیا کو بتلا دیا کہ خدا کی بزرگی و قدوسیت ہمیشہ ظلمتکدوں جیل کی دیواروں سے بلند ہوئی اور کوئی روک نہ سکا: ؎

یہی ہوگا یہی ہوتا رہا ہے ہر زمانہ میں صدائے حق ہمیشہ گونجتی ہے جیلخانہ میں

(احمق)

ہم لوگ نماز سے فارغ ہونے کے بعد تلاوت کلام مجید میں مصروف ہوئے۔ اتنے

میں بارک کھلی برادران ہنود نے باہر جاکر ضروریات سے فراغت حاصل کی اور اشنان کرکے اپنی پوجا پاٹ میں منہمک ہوگئے۔ میزبان اتنے مہربان تھے کہ آفتاب کے نکلتے ہی ایک شخص کو بھیجا جس نے فی کس ایک چھٹانک بھنے ہوئے چنے ناشتے کے لیے تقسیم کیے۔ خوب مزے لے لیکر کھائے اور چنوں کی وہ تمام تعریف ذہن میں سماگئی جو توبۃ النصوح میں درج ہی۔

میں اب جو بارک سے نکلکر چلا پھرا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی ہر لحاظ سے پوری دنیا ہی اگر دنیا کے دو حصے ہیں۔ قدیم و جدید تو یہاں بھی دو حلقے ہیں اور ہر حلقے کے رہنے والوں کے طریق زندگی میں اتنا ہی فرق ہی جتنا کہ جدید و قدیم تہذیب کے لوگوں میں اگر اس دنیا میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک مہذب۔ دوسرے نیم مہذب تیسرے وحشی تو یہاں بھی اسی تقسیم سے لوگ ہیں۔ اگر دنیا میں مذہب۔ نسب وطن اور پیشہ کے لحاظ سے اختلاف ہی تو یہاں بھی۔ ہندو۔ مسلمان۔ عیسائی۔ جینی۔ آرین۔ عرب۔ افغان۔ ڈاکٹر۔ بیرسٹر۔ وکیل۔ حکیم۔ ماسٹر۔ پروفیسر۔ موجود ہیں۔ کوئی انگریزی بولتا ہی۔ کوئی اردو۔ کوئی سنسکرت کوئی عربی۔ اگر اس دنیا میں بحر ظلمات ہی تو اس میں اس کے برعکس ملک ظلمات (کال کوٹھریاں) بھی ہی۔

یہی نہیں کہ محض تقسیم خیالی ہو اور عمل کچھ نہو۔ چنانچہ اس زندگی میں پورے طور سے دنیا کی کیفیت نظر آتی ہی۔ اسکی مستقل اور جداگانہ ضروریات تھیں جو پوری کیجاتی تھیں اس چھوٹی سی دنیا میں مختلف سوسائٹیاں قائم ہوئیں۔ مختلف جماعتیں تھیں جو اپنے اپنے مقاصد کو مدنظر رکھ کر کام کرتی تھیں مختلف تاریخیں تھیں جو اس زندگی میں خاص اہمیت رکھتی تھیں چنانچہ ہر جماعت۔ تحریک، مشغلہ یا تاریخ کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہی :۔

اخبارات ۔ جیل میں کل تین اخبار نکل سکے (۱) "بھکڑ"۔ اس کے ایڈیٹر مہابیر تیاگی تھے جنھوں نے اس کو ۲۶ جنوری کو شائع کیا چونکہ ایڈیٹر بلند شہر کے تھے اس لیے بلند شہر کی جماعت اسکے دوسرے فرائض انجام دیتی تھی ۔ اس میں صرف اندرونی و بیرونی چیزیں ہوتی تھیں ۔ پرچہ پہلے انگریزی میں نکلا تھا لیکن بعد کو اپنے ہمعصر "چونچ" کی وجہ سے اردو میں کر دیا گیا ۔ اس کو دو ہفتہ سے زیادہ زندگی نصیب نہ ہوئی ۔

(۲) ۲۶ جنوری کو کھانا کھاکر بارک میں بیٹھا تھا کہ "بھکڑ" کی آواز کان میں پڑی خیال کیا کہ اس عالم آباد میں ضروریات کو دیکھتے ہوئے ایک اخبار کم ہی اور بھکڑ تو ویسے بھی ناکافی ہی لہذا ایک اخبار اور ہو جو تمام باتوں پر نوٹ لکھتا رہے ۔ حکام کا رویہ ۔ قیدیوں کی حالت ۔ لوگوں کا طریق رہائش ۔ آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات ۔ اسی خیال کی بنا پر ۲۷ جنوری کو میں نے "چونچ" نکالا ۔ اور زندان آگرہ کی انجمنوں سے کوئی انجمن ۔ اس کی جماعتوں میں سے کوئی جماعت ایسی نہیں جس پر موقع بموقع کچھ نہ کچھ لکھا نہ گیا ہو ۔ حکام کے رویہ ۔ قیدیوں کی حالت پر وقتاً فوقتاً نوٹ لکھے گئے جس پر دونوں جانب سے توجہ بھی کی گئی ۔ یہ اخبار اردو میں تھا اور گو اڈیٹر کے علاوہ اور کوئی کاتب بھی نہ تھا لیکن خدا کے فضل سے اخیر تک جاری رہا ۔ اور اپنے فرض کو پورے طریق پر انجام دیتا رہا

(۳) "نویگ"۔ درحقیقت "بھکڑ" اور "چونچ" کی کامیابی نے مہاشے رام پرشاد مصر کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ بھی ایک اخبار ہندی میں نکالیں ۔ چنانچہ انھوں نے اس کو جاری کیا جس میں ان کے شریک کار قریباً دوسرے لوگوں کے علاوہ پانچ جوائنٹ ایڈیٹر بھی تھے لیکن اپنے پیشرو "بھکڑ" کی طرح ایک ہفتہ سے زیادہ نہ نکل سکا اس کی حیثیت ایڈیٹر اور کارکنوں کی وجہ سے ایک اخبار کی سی تھی ۔ یہ گویا دوسرا "ورتمان" (کانپور) تھا اخبارات کا تمام قاعدہ یہ تھا کہ وہ ہر بارک میں پڑھکر

سنائے جاتے تھے لیکن "نویگ" کی ایک ایک کاپی ہر بارک میں پہنچتی تھی۔
مشاعرہ - چونکہ دوسرے لوگوں کی طرح سے شعرا کی تعداد بھی کافی تھی اس لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی انجمن نہ قائم کرتے چنانچہ مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور پہلا مشاعرہ ۲۷ر جنوری کو نہایت آب و تاب کے ساتھ مولانا عارف حسن صاحب ہسوی کی زیر صدارت ہوا اور اس کے بعد یکم فروری کو ہندی مشاعرہ ہوا یہ کامیابی کے ساتھ ہر ہفتہ ہوتے رہتے تھے۔ ۲۴ر فروری اُردو مشاعرہ کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس تاریخ کو بجائے دن کے مشاعرہ شب میں کر دیا گیا۔ اور حسب دستور قدیم شمع استعمال کی گئی جو ہر شاعر کے سامنے باری باری سے رکھی جاتی تھی۔ آخری مشاعرہ ۲۹ر مارچ کو ہوا جس میں اُردو اور ہندی کی نظمیں ساتھ ہی ساتھ پڑھی گئیں۔ مشاعرہ کا رنگ زیادہ تر قومی اور سیاسی ہوتا تھا۔ ہر شخص بقدر پرواز لطافت زبان کا بھی خیال رکھتا تھا۔
انجمن حیوانات - جب ہر طرف انجمنیں کھلنے لگیں تو یہ کیسے ممکن کہ حیوانیات کے ماہر چپ بیٹھے رہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی ایک انجمن بنائی اور اس کی ایک کانفرنس جس میں تمام دنیا کے حیوانات شریک ہوئے تھے جناب ریچھ کی زیر صدارت ہوئی اس میں انجمن کے مقاصد کی تبلیغ اور انجمن کے قواعد بنائے گئے۔ اس کے مختلف اجلاس ہوئے۔ آخری اجلاس بڑی شان کا تھا جس میں جناب صدر نے نہایت بلند آہنگی سے حاضرین کو سمجھایا کہ "ہم انسان سے بالاتر ہیں چنانچہ انسان خود ہمارے بادشاہ شیر کو شجاعت شرافت میں۔ لومڑی کو چال بازی و عقل میں ہرن کو پھرتی اور خوبصورتی میں تسلیم کر چکا ہے" اس انجمن کے اجلاس میں حیوانات اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔
انجمن تعلیم - جہاں اور انجمنیں تھیں وہاں تعلیم کی ایک انجمن بھی تھی۔ اس انجمن کا کام یہ تھا کہ لوگوں کو جو سیکھنا چاہتے مختلف زبانیں سکھلاتی تھی چنانچہ کچھ مسلمان ہندی اور کچھ ہندو اُردو۔ بعض حضرات بنگلہ۔ بعض انگریزی سیکھتے اور سکھاتے تھے۔

اسی انجمن کے زیر اہتمام کئی بار مختلف مباحث پر تقریریں بھی ہوئیں۔ اسی انجمن کے ساتھ ساتھ یا اس کی ایک شاخ اور انجمن تھی جس کے اراکین ایک دوسرے سے جا کر ملتے اور وہاں کی سیاسی حالت بیان کرکے اس پر بحث کرکے اپنے آئندہ کام کے لیے کوئی راہ اختیار کرتے۔ سب سے زیادہ خاموش یہی جماعت تھی۔

تیوہار۔ تیوہار اپنی اپنی خصوصیتوں کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اور ہندو مسلمان دونوں یکساں حصہ لیتے۔ تمام جیل کا کھانا ایک جگہ پکتا اور سب ایک قطار میں بیٹھکر کھاتے۔ میری تین ماہ کی قید میں صرف تین تیوہار پڑے۔ بسنت، شب برات، ہولی، بسنت کی وہ کیفیت تو مجھے ابتک یاد ہی جب مغرب کے وقت اس کے منتظمین کو بھوک کے عالم میں یہ شعر سنایا جاتا ہے

دیا آنتوں نے استعفا بسنتی میہماں ہو کر
بہت گائے بجائے آخرش بھوکے رہنے ن بھر

تبادلہ۔ جیل میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہی تین قسم کے مجرمین تھے۔ سیاسی غیر سیاسی اخلاقی ہو خرالذکر کی حالت تو یکساں تھی۔ لیکن اول الذکر جماعتوں میں تبدیلیاں ہوتی رہیں چنانچہ ۱۹ ر فروری کو پہلا حکم آیا جس کی روسے چالیس سے زیادہ غیر سیاسی قیدی سیاسی بنا دیے گئے۔ اُس میں راقم بھی شامل تھا۔ ۸ ار فروری کو دوسرا حکم آیا جس میں غیر سیاسی قیدیوں کی ایک جماعت کو فیض آباد بھیجدیا گیا۔ اسی طرح ۶ ر مارچ کو بقیہ تمام غیر سیاسی قیدی آگرہ سنٹرل جیل منتقل کردیے گئے۔ ان لوگوں کے انتقال کے بعد جیل میں وہ چہل پہل نہ رہی اور وہاں کی زندگی کا ایک حد تک خاتمہ ہوگیا۔

میں اس تبادلہ کی زد میں دوبارہ آیا اور ۱۵ ر اپریل کو آگرہ ڈسٹرکٹ جیل سے آگرہ شہر جیل میں منتقل کردیا گیا۔ اپنے انتقال کے بعد سے مجھے نہیں معلوم کہ اس عالم میں کیا ہوا اور کیا ہوتا ہی۔

اس چھوٹی سی دنیا میں ہر شخص اپنے مذہب کا پابند تھا اگر ایک جانب نماز ہوتی

تھی تو دوسری طرف ہوں ایک گروہ کلام پاک کے درس و فکر میں مصروف تھا تو دوسرا گیتا کے مطالعہ میں لیکن باوجود ان اختلافات کے بھی اتحاد و اتفاق جیل کی زندگی کا خاصہ تھا۔ وہاں خلافت اور ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا جو سب کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا اور جس کی سب کو دھن لگی ہوئی تھی ان سطور کو دیکھ کر ممکن ہے کہ ایک شخص کا ذہن اس طرف جائے کہ یہ جیل نہ تھا بلکہ ایک محل سرا اور یہ قیدیوں کی زندگی نہ تھی بلکہ عیش و راحت کے ایام تھے لیکن وہاں کے رہنے والے جانتے کہ وہ جیل خانہ تھا جس میں وہ قید تھے اور باہر کے لوگ نہیں معلوم کر سکتے کہ ان تمام کے باوجود کیا تکالیف تھیں۔ مثال کے طور یہ بیان کرتا ہوں کہ جب گرمی سخت پڑنے لگتی اور بارکوں میں مچھروں کی کثرت اور گرمی کی وجہ سے راتیں بلا سوئے گزرنے لگیں تو اس امر کی شکایت کی لیکن کامل پون مہینہ کے قریب بغیر تہبند کے گزارنے کے بعد باہر سونے کی اجازت دی گئی اور باوجود اس کے کہ گورنمنٹ کا یہ اعلان تھا کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں جیسا کہ انگلستان میں اول درجہ کے سیاسی قیدیوں کے ساتھ ہوتا ہے ہم یہ دیکھتے تھے کہ ہمارے ساتھ تیسرے درجہ والوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا اور یہ تمام زندگی جس کے کچھ واقعات اوپر بیان کیے جا چکے ہیں محض اس بنا پر تھی کہ قریباً تمام قیدی مرنج مرنجاں نوع کے تھے انھی میں وہ شخص بھی جو ڈیوک آف کناٹ کا باڈی گارڈ تھا لیکن جو جگی پہنے، زمین پر سوتے کے بعد اس سے زیادہ مسرور ہوتا تھا جتنا کہ وہ اپنے کو اس وردی میں دیکھ کر ہوتا تھا۔ انھی میں وہ نوعمر شخص بھی تھا جس کے شادی کا کنگنا جیل میں ہی کھلا تھا اور کنگنے کے بجائے اس کے ہات میں ہتکڑیاں پڑی تھیں۔ انھی میں وہ شخص بھی تھا جس کا بٹا ہوا بان کئی کئی گز تک اس کے ہات کے خون میں رنگا ہوتا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ لوگ ہمیشہ خوش رہے چنانچہ جب لوگوں کو سنٹرل جیل میں منتقل

کردیا گیا تو باوجود اس کے کہ وہاں ان کے ساتھ تقریباً ویسا ہی سلوک کیا جاتا تھا جیسا کہ عام قیدیوں کے ساتھ لیکن پھر بھی ان کی زندگی وہاں بھی ایسی ہی رہی جیسی کہ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل میں تھی۔ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ جسمانی تکالیف ان پر اثر نہیں کرتی تھیں بلکہ ان کا اطمینان ضمیر جس سے وہ مصیبت کے وقت بھی شاداں وفرحاں رہتے تھے۔ رہروانِ راہِ حق کو پھولوں کی سیج اتنی بھلی نہیں معلوم ہوتی جتنی کہ آبلہ میں چبھنے والی خار کی نوک۔ اس لیے کہ آبلہ میں چبھنے والی نوکِ خار نقابِ یار میں ایک روزن پیدا کردیتی ہے جس میں سے اس کی منتظر نگاہیں جلوۂ یار دیکھ سکیں فاعتبروا یا اولی الابصار

جامعہ ملیہ اسلامیہ

جن خاص حالات و واقعات کے ماتحت وجود میں آئی وہ تمام تعلیمگاہوں کی تاریخ میں ایک خاص نوعیت رکھتا ہے۔ شاید ہندوستان کی کوئی درسگاہ ایسی نہ ہوگی۔ جس کی بنیاد ایسے زمانہ میں پڑی ہو جب کہ ساری قوم ایک سیاسی جنگ میں ہمہ تن پیکار ہو۔

وجہ قیام جامعہ جب مسلمانان ہند نے ترک موالات کو شرعی ضرورت میں قبول کیا اور انکے لئے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف لڑنے والے فریق سے ولایت اور اعانت کا رشتہ جائز نہ رہا۔ اسکی محبت و وفاداری، اطاعت اور مددگاری مناسب نہ رہی اور ملک نے یہ فیصلہ کر دیا۔ کہ وہ تمام درسگاہیں خالی کر دی جائیں، جہاں حکومت کے منشا کے مطابق تعلیم دی جا رہی ہو۔ اور جہاں سے ایسے لوگ پیدا کئے جاتے ہوں جو اس حکومت کے لئے دست و بازو کا کام دیں جو آزادی اور امن کو ہندوستان اور ہندوستانیوں کے پامال کر رہی ہے تو سب سے پہلے اس مطالبہ کا عملی جواب علیگڑھ سے دیا گیا اور اس جوش و خروش کے ساتھ دیا گیا۔ جس کا بہت اندازہ اسوقت عمال حکومت کی پریشانیوں اور بیچینیوں سے ہو سکتا تھا۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ملک کی دعوت پر ابتدا میں جو امید افزا جواب ایک درسگاہ سے ملا تھا وہ اتنا صادق اور راسخ ثابت نہ ہوا۔ درحقیقت یہی ایک ایسی زبردست کمی تھی جس سے درسگاہ کی تمام تعلیم کی کیفیت عیاں ہو گئی اور ایک جدید تعلیم گاہ کی بنیاد لازمی سمجھی گئی۔ یہی زبردست کمی اُن تمام درسگاہوں میں ہے جو حکومت موجودہ کے نظام کے ماتحت چل رہی ہیں کہ وہاں راسخ عمل اور سچائی ہے

سمجھنے کی قوت بالکل سلب ہو جاتی ہے۔

قومیت یا ملت سازی کے لئے لازم ہے کہ تعلیمی آزادی حاصل کیجائے۔ جبتک کوئی قوم اپنی آیندہ نسل کی تعلیم کو اپنے قبضہ میں نہیں کرتی سیاسی حیثیت سے اُس کا مغلوب رہنا لازمی ہے۔ سرکاری نظام کے ماتحت یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں بلاشبہ ایسی تعلیم دیجا رہی ہے۔ جو اُسی طرح ناقص ہے۔ جس طرح اجنبی حکومت کی تعلیم کو ناقص ہونا چاہیئے۔ وہاں ہمیں اسلئے تعلیم نہیں دیجاتی کہ ہم ملک وملت کیلئے مفید بنیں بلکہ اسلئے کہ اجنبی حکومت کے لئے کار آمد ہوں۔ اگر ہم کو تنازع للبقا میں اپنی قومی ہستی کو قائم رکھنا ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا گھر ہمارے سلئے ہو اور ہم آزادی و امن کی زندگی بسر کریں۔ تو یہ لازم تھا کہ ہم اُن تمام تعلیم گاہوں کو یکلخت الوداع کیدیں کہ جہاں سے نکلنے کے بعد بجائے اس کے کہ ہم اپنی قومی مذہبی آزادی کے معین ومددگار ہوں ہم روڑے بنکر راستے میں آجاتے تھے پس ایک ایسی تعلیم گاہ کا قیام ضروری تھا جہاں سے ہندوستان کی آزادی کے لئے سب سے بہتر سپاہی نکل سکیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا مطمح نظر یہی ہے کہ یہاں سے ایسے نوجوان پیدا ہوں جو نہ صرف حسبِ معیارِ زمانہ تعلیم یافتہ وتربیت یافتہ شمار کئے جائیں۔ بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں۔ جنمیں اسلام کی حقیقی روح ہو، اسلام کی تعلیمات کے سچّے اور عملی نمونے ہوں اور مذہب کی خدمت کیلئے اپنے کو نثار کر سکیں،

موجودہ یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ اور مشرقیہ کی طرف کسی قسم کی کوئی توجہ نہیں دیجاتی۔ وہاں عام طور سے علوم مشرقیہ کو مردہ تصور کرتے ہیں حالانکہ لامارک کا قول ہے کہ استقلال باعثِ حیات ہے۔ کسی چیز کا استعمال نہ کرنا اُسکی نمو اور بالیدگی یہانتک کہ اُسکی زندگی کے لئے مہلک ہوتا ہے ہمارے

علوم مردہ یا بیکار نہیں ہیں بلکہ استعمال نہ کئے جانے کے باعث مردہ یا زندہ درگور ہیں۔ ہندوستان کی محکومیت کا یہی ایک سب سے اہم راز ہے کہ ہم اپنے تہذیب تمدن کو اپنے علوم و فنون کو اپنے فلسفہ و حکمت کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ جو تعلیم عام طور سے کالجوں اور اسکولوں میں رائج ہے قومی نقطۂ نظر سے بالکل ناقص ہے۔ بلکہ سر سید مرحوم کی رائے میں تو یہ خچر بناتی ہے۔"

مقصد جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی نوعیت کی سب سے پہلی درسگاہ ہے۔ جہاں اس بات کا عملی ثبوت ملے گا کہ صرف سچے ہی مسلمان سچے ہندوستانی ہوسکتے ہیں۔ صحیح حُبِ وطن اور راسخ قوم پرستی اسلام کی صحیح تعلیمات کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کی سیاسی گتھی کا سلجھنا، دوسری ہمسایہ قوم کے ساتھ برادرانہ و مخلصانہ برتاؤ کا پائیدار ہونا محال ہے تاوقتیکہ قرآن کریم اور تعلیمات اسلامی کے صحیح معنوں پر عمل کرنے والے نہ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی اقوام میں اب تک جو کشمکش رہی ہے اُس کا باعث صرف صحیح اور سچی مذہبی تعلیم کا فقدان ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمونہ جو جامعہ قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اُس سے ہم اُمید کرتے ہیں کہ ہندوستان کو اب بہت جلد اس مہلک مرض سے نجات ہوجائے گی جو ہماری غلامی اور محکومیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

دینی تعلیم جامعہ ملیہ نے قرآن کریم، حدیث، سیرۃ، فقہ اور عقائد کی تعلیم نہ صرف اس غرض سے دینے کا تہیہ کیا کہ ان تمام مضامین سے ضروری اور صحیح واقفیت ہوجائے بلکہ خاصکر اس مقصد سے کہ طالب علم کے دماغ پر یہ بخوبی روشن ہوجائے کہ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات، عقائد اسلامی کی صداقت، احکامِ اسلامی کی عملی سودمندی اور اُس پر سختی کے ساتھ عملی زندگی میں کاربند ہونے پر مبنی تھیں اور اگر ہم اپنی گم شدہ عظمت کو واپس لینا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی

اور یہی ایک طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کار بند ہو جائیں اور رسول مقبول صلعم کے نقش قدم پر چلیں۔ چنانچہ پہلی مرتبہ ہے کہ جامعہ میں دینی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے۔ جو کہ اب تک کسی دوسری درسگاہ میں نہیں ہوا۔ اس طرح سے گویا علوم دینی و دنیوی ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہوئے ہیں۔ جن سے مغائیرت کا وہ پردہ جو دونوں کے درمیان حائل ہو گیا تھا اور جس نے علم دین کو بے حس اور علم دنیا کو بے روح اور بعید از خدا بنا رکھا تھا اوٹھ جائیگا اور ہم رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ کا صحیح مصداق ہونگے۔

اخراج از ایم۔ اے۔ او کالج

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جن غیر معمولی حالات میں جامعہ کا قیام وجود میں آیا ہے وہ عجیب و غریب ہیں۔ وہ زمانہ ایسا نہ تھا کہ کسی ایسی بڑی آزاد درسگاہ کی بنیاد ڈالی جاتی جس کا خواب جسٹس سید محمود مرحوم نے ۱۸۷۳ء میں دیکھا اور جس قسم کی آزاد قومی درسگاہ وہ مسلمانوں کے لئے چاہتے تھے اُس کا قیام اسقدر تیزی اور بے سر و سامانی سے عمل میں آنا یقیناً تعجب خیز ہے۔ جامعہ ملیہ اپنے اعلان قیام کے ٹھیک دوسری صبح کو اُس چہار دیواری سے ایک میل باہر نکال دیا گیا جس کے بانی کی نیت یقیناً وہی تھی جو حضرت شیخ الہند مرحوم کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ ناظرین۔ اخبارات کو یاد ہو گا کہ یہ چھوٹی سی جماعت صرف اس وجہ سے جلا وطن ہوئی کہ اُس نے وہ کیا جو قرآن کریم کی تعلیمات کی بنا پر ضروری تھا۔ یہ چھوٹی سی خوش و خرم جماعت اپنے سرمایۂ ناز سرمدار مولانا محمد علی صاحب کے ساتھ مجاہدانہ اُس میدان میں مقیم رہی جہاں چند خیمے نصب تھے۔ تعلیم اسلام کا ذوق۔ خدمت

اسلامی کا ولولہ قومی و ملکی سرفروشی کا جوش تھا۔ جو اُس میدان کی زندگی کو پُرلطف بنائے ہوئے تھا۔

انتظام و تنظیم | جامعہ کی تاریخ میں وہ ایام قابلِ یادگار ہیں۔ جبکہ جامعہ کا کل کارکن عملہ صرف ایک واحد شخصیت کے اندر پنہاں تھا۔ وہ مقدس شخصیت مولانا محمد علی کی تھی۔ جامعہ کا کل کام طلباء اپنے ہاتھوں انجام دیتے تھے۔ ہر طالب علم اپنی ذمہ داری کو اُسی طرح محسوس کرتا تھا جس طرح کسی تعلیمگاہ کے ارکان اور کارکنان کو ہونی چاہیئے۔ گویا اس طرح سے جامعہ اپنے فرزندان کو سیلف گورنمنٹ کی عملی تعلیم دے رہا تھا۔

جامعہ کے ابتدائی زمانہ میں جیسی بے سروسامانی تھی اور اتنی بڑی درسگاہ کے لئے جس قسم کے اسباب وسامان کی ضرورت ہونی چاہیئے تھی نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ قیامِ جامعہ کی پہلی ہی شام سے سامان کی فراہمی کا خیال چھوڑ دیا گیا تھا وہاں تو مقاصد اور مطالبات کی بہم رسانی کی لَو لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ اُس وقت کسیکو کسی قسم کی شکایت نہ ہوسکی۔ نہ اسباب کی حاجت ہوئی اور نہ سامان کی ضرورت۔ علیگڑھ کی سردی کے کل ایام میدان اور خیموں کی رہائش میں گذر گئے۔ اور کبھی ڈاکٹر یا حکیم تک کے بلانے کی نوبت نہ آئی۔ ایک سرفروشانہ زندگی تھی۔ دنیا کی تمام دلفریبیاں اور سحر کاریاں ناکام ہو چکی تھیں۔ مقصد تھا تو صرف ایک اور وہ "آزادی" جس سے ہماری ساری آرزوئیں اور امیدیں وابستہ تھیں۔

قومی و ملکی خدمت | اس کے بعد جامعہ کی تاریخ میں وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے۔ جبکہ قریب قریب تمام طلباء خدمتِ قومی کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ کسی طرح ڈیڑھ سو برس کی غلامانہ زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ جامعہ کے تقریباً ۱۵۰ نونہال تبلیغ و اشاعت کے لئے

سرزمین ہند کے مختلف گوشوں میں روانہ کئے گئے۔ انہوں نے جس فدایانہ اور جانبازانہ طریقہ سے یہ اہم فرض انجام دیا اُسپر اکابر ملک نے جو خراج تحسین وقتاً فوقتاً دیا وہ کسی درسگاہ کے ابتدائی زمانہ میں ملنا ناممکن تھا۔ انگلستان کا مشہور رسالہ نیشن اینڈ ایتھینیم نے ابھی حال میں تحریک آزادی ہند کے سلسلہ میں یہ خیالات ظاہر کئے تھے:۔

"ہندوستان میں تحریک خلافت اور سلطان ترکی سے وابستگی کا جذبہ کس طرح پھیلا؟ گذشتہ بارہ سال کے عرصہ میں علی گڑھ کالج سے جس کو سر سید احمد نے قائم کیا تھا مولانا محمد علی و شوکت علی کے اثر سے موجودہ نسل کے سب سے زیادہ ہونہار فرزندوں نے وہاں سے نکلکر اتحاد اسلامی اور قومیت پرستی کی اسپرٹ کو ہندوستان کے اس سرے اُس سرے تک پھیلادیا۔ یہ بات ماننی پڑیگی کہ مسئلہ خلافت اسی جماعت کی تبلیغ سے عوام تک پہنچا۔"

طلبار جامعہ نے نہ صرف ملک کی یہ خدمت انجام دی بلکہ جامعہ کو اسبات کا بھی فخر ہے جو شاید کسی دوسری تعلیم گاہ کو نہ ہوگا کہ اُس کے بیشتر فرزندوں نے اپنی ایثار و قربانی کی ہولا جواب مثال مختلف حصص ملک سے قید کی سزاؤں کو قبول کرکے دی ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں طلبا کا ایک سنہرا کارنامہ شمار کیا جائیگا۔ ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے اکثر ابتک بانیِ جامعہ کی طرح جیل میں ہیں۔

درس و تدریس

جولائی ۱۹۲۱ء سے جامعہ کے درس و تدریس کا باقاعدہ دور شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل جامعہ سے صرف ایک تبلیغی تعلیم و تربیت کا بیڑا اُٹھایا تھا جو تحریک سیاسی کے لئے مفید ہو سکے مگر اس دوسرے دور سے جامعہ نے مختلف علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا علاوہ

بی۔اے کی معمولی سند کے علوم اسلامی، ادب والسنہ عربی، فارسی، انگریزی اُردو۔اور فرانسیسی، فلسفہ تاریخ، ریاضی، اجتماعیات، قانون اور سائنس کی تعلیم کا بند وبست کیا۔اور اس طرح سے جامعہ اب ایسے سپاہی تیار کر رہا ہے جو آئندہ والی جنگِ آزادی میں ہر شعبہ کے لئے بہتر اور مفید ہو سکیں گے۔جامعہ نے ایک عمدہ تجربہ گاہ (لیبورٹیری) کا بھی انتظام کر لیا ہے۔

دروس نصاب موجودہ ہندوستانی یونیورسٹیوں میں جو نصاب جزو تعلیم ہیں وہ سب غیر ملک کی زبان میں ہیں جو ایک نامعقول اور غلامانہ طریقہ ہے جس سے مغائرت زبان کی وجہ سے طالب علم پر مسائل کا صحیح اور روشن نقش نہیں پڑتا اور نہ اصلی علمی ذوق پیدا ہوتا ہے۔ البتہ طوطا زبانی سے امتحان پاس کر لیا جاتا ہے۔اور عموماً مروجہ درسیات سے طالب علم پر یہ اثر ہوتا ہے کہ مشرق اور ممالک اسلامیہ علم کی ضیاء سے محروم رہے ہیں۔ہندوستان اہلِ فرنگ کی آمد سے قبل ایک تاریک دیار تھا۔ حالانکہ یہی یورپ کل تک مشرق کا دست نگر تھا۔اور آج بھی بہت سے رموزِ علمیہ میں ایشیا کا محتاج ہے چنانچہ اس سے طلباء کے دلوں میں افسردگی اور مایوسی پیدا ہوتی ہے۔جو قوموں کی ترقی کے لئے سمِ قاتل ہے۔ یہ واقعات ہیں کہ کتبِ سیر و تواریخ میں ایسے غلط اور متعصبانہ خیالات ہیں جن کا منشاء صرف ہندوستان کی مختلف قوموں میں نفاق کا بیج بونا ہے۔چنانچہ جامعہ ملیہ اسوقت ایسے مفید اور صحیح نصاب کی تیاری میں مصروف ہے۔جو انشاء اللہ بہت جلد اس کمی کو پورا کر دیگا۔

جامعہ نے حتی الامکان اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ہندو طلباء کیلئے بھی ہندو اخلاقیات اور سنسکرت کا انتظام رہے۔ اسی طرح سے مثل اردو کے ہندی بھی لازمی اور ضروری قرار دیگئی ہے۔

صنعت وحرفت

موجودہ درسگاہوں کے تعلیم یافتہ نوجوان عموماً محنت کے عادی نہیں ہوتے اور کچھ تو اپنی تعلیم کے بے سود ہونیکے سبب سے تعلیم ختم ہوتے ہی تلاشِ ملازمت میں منہمک ہوجاتے ہیں چنانچہ جامعہ نے صنعتی اور حرفتی تعلیم کو بھی دینی تعلیم کی طرح ضروری قرار دیا ہے۔ علاوہ ظاہری منفعت کے حرفت کو عملاً اختیار کرنے میں تعلیم یافتہ نوجوان کو محنت وجفاکشی کی ضرورت اور اہمیت معلوم ہو گی۔ نیز اُس مغایرت کا جو آج حرفت اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان پیدا ہو گئی ہے۔ خاتمہ ہو جائیگا۔ اور ایک طالب علم کی آیندہ زندگی میں ذرائع معاش کو وسعت دینے کے علاوہ خود حرفتوں کی ترقی کا باعث بھی ہو گی۔ اور ایک تعلیم یافتہ نوجوان حرفت کے محدود دائرہ پر قانع نہ ہو جائیگا۔ بلکہ مزید ترقی اور ایجاد و اختراع کی جانب بھی قدم بڑھا سکیگا۔ چنانچہ پارچہ بافی قفل سازی اور مطبع (لیتھو اور ٹائپ) کے کام کے سکھانیکا خاطر خواہ انتظام ہے۔ گو دوسرے حرفے بھی زیر تجویز ہیں۔

کتب خانہ

بانیِ جامعہ نے جس طرح جامعہ ملیہ کے لئے اپنی قیمتی عمارت وقف کر دی تھی۔ اُسیطرح اپنی بہترین لائبریری بھی جامعہ کو مرحمت فرمائی ہے۔ کسی علمی درسگاہ کو اُسوقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا جبتک کہ اُس کے پاس ایک بہترین کتب خانہ نہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح افراد کی زندگی کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے کسی تعلیمگاہ کے لئے کتب خانہ کا ہونا اُسیقدر لازمی ہے۔ ایسے حالات کے اندر جبمیں سے کہ جامعہ گزر رہی ہے، کوئی مشبہ نہیں ایک وسیع کتب خانہ کا مہیا کرنا بالکل دشوار ہے۔ تاہم عربی کا کافی ذخیرہ مطبوعہ وقلمی فراہم ہو چکا ہے۔ اسیطرح سے خواجہ عبدالمجید صاحب شیخ الجامعہ کی فیاضی سے انگریزی کتب میں بھی معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ کتابوں کی فراہمی کے لئے جامعہ کو زیادہ جد وجہد کی ضرورت نہو گی۔ کیونکہ جسقدر کتابوں کے استعمال کا بہترین حق یہاں ادا ہو سکتا ہے۔ ذاتی کتب خانوں میں ناممکن ہے جہاں کہ کتابیں یا تو آرائش کی غرض سے رہتی ہیں یا کیڑوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ گو دیگر ممالک یورپ کی طرح ابھی یہاں مطابع اور مصنفین کی جانب سے مفت نہیں آتیں تاہم کتبخانوں کی ضرورت اور اہمیت عیاں ہو چکی ہے۔

دارالمطالعہ کتب خانہ کے ساتھ ساتھ آجکل رسائل واخبارات کا مہیا کرنا بھی ایک تعلیم گاہ کا جزو قرار پا گیا ہے۔ ایک طالب علم دیگر اقوام عالم کی ترقی کا مطالعہ کیونکر کر سکتا ہے۔ کرۂ ارض کے دوسرے حصوں پر بسنے والوں کی ہمدردی وامداد کے لئے کیسے آواز اٹھا سکتا ہے۔ زمانہ کی رفتار کے مطابق شاہ راہِ ترقی پر کس طرح گامزن ہو سکتا ہے؟ تاوقتیکہ ان حالات وواقعات سے وہ پوری طرح باخبر نہو۔ اور یہ رسائل واخبارات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جامعہ ملیہ نے اس قلیل عرصہ میں اس طرف بھی توجہ کی ہے اور ایک دارالمطالعہ قائم کیا ہے۔ جہاں ہر طرح کے اور ہر زبان کے اخبارات ورسائل آتے ہیں۔

پریس قومی عروج وترقی کے لئے جسقدر معین ومددگار مطابع ثابت ہوئے شاید کوئی دوسرا شعبہ نہیں ہو گا۔ کوئی قوم اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اُسکے پاس بہترین اور مکمل پریس نہو۔ آج ہندوستان میں جس چیز کا فقدان ہے وہ علوم وفنون ودیگر معلومات کو پھیلانے کے ذرائع مصنفین اور مصلحین کی کمی نہیں مگر افسوس ہے کہ انکے خیالات دیہاتیوں کے رہنے والوں تک نہیں پہونچ سکتے یہی وجہ ہے کہ کسی تحریک کو علم پسند بنانے میں بہت زیادہ عرصہ لگ جاتا ہے۔ فرانس [illegible] ستان

اور امریکہ کی حالت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن ممالک کا عروج ٹھیک اُسی وقت سے شروع ہوا ہے۔ جب سے کہ ان اقوام نے اپنے مطابع کو اعلےٰ پیمانہ پر کرلیا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں مطابع کو دیگر ممالک سے کئی گُنا مکمل اور اعلےٰ پیمانہ پر ہونا چاہیئے تھا۔ اردو پریس میں تکمیل اور اختراع کی ابھی اسقدر گنجائش ہے کہ جتنی کسی چیز کی ابتدا میں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ نے اس طرف بھی قدم اوٹھایا ہے۔ اور ایک نہایت عمدہ پریس قائم کیا ہے امید ہے کہ پریس کی تکمیل کا سہرا بھی جامعہ ہی کے سر رہیگا۔

ان تمام خصوصیات سے بالا تر جو چیز جامعہ کے پاس ہے وہ ایثار و قربانی اور وطنیت و قومیّت کی تعلیم ہے۔ مذہب کے لئے سب کچھ برداشت کرنا جامعہ کے طلباء کے لئے سب سے معزز انعام ہے۔ ملک کی آزادی کے لئے مرمٹنا سب سے زیادہ فخر ومباہات کا باعث ہے۔ انسانیت، سچائی اور حق کی پاسداری وحفاظت کرنا مقصد اولین ہے۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں۔ جو دوسری درسگاہوں میں مفقود ہیں۔ یہی وہ تربیت وتہذیب ہے جو تمام درس گاہوں کی تعلیم کے نتائج ہونے چاہئیں۔ نواب عماد الملک بہادر نے عرصہ ہوا علی گڑھ کالج کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"اس میں شک نہیں کہ نان و نمک کی تلاش ضروری ہے۔ لیکن انسان بدنی غذا کا اسقدر محتاج نہیں جتنا روحانی غذا کا۔ جسطرح جسم نان و نمک سے سیر

نہیں ہو سکتا۔ روح محض کتابوں سے سیراب نہیں ہو سکتی انسان کی زندگی کے لیے سب سے مقدم تربیت و تہذیب ہے جن سے دماغ صیقل پاتا ہے۔ اور دل روشن ہوتا ہے۔"

درحقیقت یہی ایک غرض ہے جو ہمارے پیش نظر ہے اور یہ چیز کسی درس گاہ کو یونیورسٹی یا جامعہ کا لقب دیدینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ سر تھیوڈور ماریسن سابق پرنسپل علیگڑھ کالج نے کیا خوب کہا تھا۔

"سچ پوچھئے تو میں یہ بات چنداں ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ کو یونیورسٹی کا لقب ملجائے آپکی قوم کو یونیورسٹی کے نام کی ضرورت نہیں بلکہ اُس چیز کی ضرورت ہے جسے "یونیورسٹی" کہتے ہیں۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ انشاءاللہ ملتِ اسلامی کی صدسالہ گمراہی و ضلالت کا علاج ثابت ہوگا اور قوم جو غلامی و محکومی کی جس قعرِ مذلت میں ابتک پڑی ہوئی تھی اُس سے نکال کر آزادی دلانیکا باعث ہوگی۔

اخلاق حسنہ

ایک مُور (اسپین کا مسلمان باشندہ) اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا کہ دفعتہً ایک ہسپانوی سوار اس کے پاؤں پر گر پڑا اور درخواست کی کہ "مجھے میرے تعاقب کرنے والوں سے پناہ دو۔ مُور نے اُسے پناہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ اور بنگلہ کے ایک کمرہ میں بند کر کے باہر سے قفل لگا دیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مُور کے بیٹے کی لاش اسکے سامنے لا کر رکھدی گئی۔ قاتل کا حلیہ بیان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہی ہسپانوی سوار ہو جسکو مقتول کے باپ نے اپنے یہاں پناہ دی ہو۔ اس نے اس صدمہ کو بڑی مستقل مزاجی سے برداشت کیا۔ اور قاتل کی پناہ دہی کے واقعہ کو چھپائے رکھا۔ جب رات ہوئی تو اس نے قاتل کے کمرہ کا دروازہ کھولا اور کہا کہ "جس نوجوان کو تو نے قتل کیا ہے وہ میرا اکلوتا بیٹا تھا تیرا یہ فعل تجھے سخت سے سخت سزا دلوا سکتا ہے لیکن میں تجھے پناہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا اور پھر میں بدعہدی کر کے اپنے سخت ترین دشمن سے بدسلوکی کرنا نہیں چاہتا۔" اس کے بعد ایک تیز گھوڑے پر زین کسی اور کہا کہ "لو! اس پر سوار ہو کر رات کی تاریکی میں نکل جاؤ تمھارے ہاتھ خون آلود ہو چکے ہیں لیکن خدا منصف ہے اور میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے ایفائے عہد میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا میں اپنا فیصلہ خدا کو سونپتا ہوں"۔ اعلیٰ کریکٹر کی مثال قائم کرنے والے کا نام صفحہ ہستی سے کبھی نہیں مٹ سکتا۔

خطبہ صدارت

(انجمن اتحاد ملیہ (جسکا خطبۂ صدارت آپ کے پیش نظر ہے) طلبا کی منظم صورت میں ایک جماعت ہے۔ اسکی مجلس کارکن ایک صدر، ایک معتمد اور ایک مجلس انتظامیہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ طلبا کی علمی و اخلاقی اصلاح و ترقی کا دار و مدار تمامتر اس جماعت پر ہوتا ہے۔ اراکین جامعہ، اساتذہ طلبا نیز باہر کے حضرات کی نظروں میں یہ انجمن ایک خاص وقعت اور اہمیت رکھتی ہے۔ اہل علم اور اکابر قوم گاہ گاہے اسکی دعوت پر تشریف لاکر اپنے خیالات سے طلبا کو مستفید کرتے ہیں ہر سال اسکے نئے عہدہ داران اور اراکین کا عام انتخاب ہوتا ہے اور نئے صدر کی رسم تاجپوشی، حلقۂ جامعہ میں شاہانہ تاجپوشی سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اس سال کی صدارت کا سہرہ جناب شفیق الرحمن صاحب قدوائی کے سر پر بندھا جس کے پر زور و پر اثر خطبۂ صدارت کے بعض حصے ہم ناظرین جوہر کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جس سے انجمن کا صحیح اندازہ غالباً ہو سکے۔ وھو ہذا۔ جوہر۔

جناب صدر، محترم اساتذہ، و برادران جامعہ

اگر رسم زمانہ کو راہ دوں تو میرا پہلا فرض آپکا شکریہ ادا کرنا ہے کہ آپ صاحبان نے بالاتفاق اس انجمن کا نائب صدر منتخب کرکے مجھے وہ عزت اور امتیاز عطا فرمایا ہے جو اس جامعہ کے کسی طالبعلم کے لئے انتہائی مسرت اور فخر کا باعث ہو سکتی ہے، لیکن آپ مجھے معاف فرمائیں اگر میرا ضمیر مجھے ان

رسمی قیود کی پابندیوں سے اسوقت باز رہے کہ آپ کی محبت اور اخلاص کے دلکش نظارہ سے میری
آنکھیں خیرہ ہو رہی ہیں، اسوقت شکریہ اور احسانمندی کی زبردست لہریں میرے سینہ میں ضرور موجزن
ہیں لیکن اسلئے نہیں کہ آپنے مجھے صدر نشینی کا افتخار بخشا ہے بلکہ محض اسلئے کہ آپکی نگاہ کرم نے
اس انجمن کی خدمت کے لئے مجھی کو انتخاب کیا اور اسطرح میری آرزوئے خدمتگذاری
کے لئے ایک تازہ میدان عمل مہیا کر دیا۔ پس اگر صمیم قلب سے میں آپ حضرات کا
شکریہ ادا کروں تو بیجا نہیں کہ خدمت ہی وہ سعادت ہے جسکی طلب مجھے اپنی جدید
ذمہ داریوں کے قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ . . . .

حضرات! اب میں آپکی توجہ تھوڑے عرصہ کے لئے انجمن کی گذشتہ تاریخ کیطرف
مبذول کرنا چاہتا ہوں، آپ میں سے غالباً ہر شخص اس سے بخوبی واقف ہوگا کہ ایک زمانہ تھا
جب ایم۔ اے۔ او کالج کی تعلیم دوسری درسگاہوں کے مقابلہ میں زیادہ حریت نواز اور صحیح
اخلاق و جذبات پیدا کرنیوالی سمجھی جاتی تھی یہ ایک امر واقعی ہے جسکی حقیقت سے کبھی انکار نہیں
کیا جا سکتا لیکن اگر اس خصوصیت کی وجہ تلاش کیجائے تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ
اسکا سہرا طلبا کی ایک انجمن "سٹوڈنٹس یونین کلب" کے سر رہیگا جسکے گہوارہ میں خودداری یگانگت
اور اتحاد کے خیالات کی پرورش ہوتی تھی یہ انجمن تمام طلبا کی انتخاب کردہ ایک جماعت کے
زیر انتظام تمام خدمات انجام دیتی تھی ارباب حل و عقد نے جنکی استبدادیت کا پارہ آخری درجہ
تک پہونچ گیا تھا کبھی گوارا نہ کیا کہ اس انجمن کو کلی طور پر طلبا کے ہاتھوں میں دیدیا جائے
لیکن باوجود طرح طرح کی رکاوٹوں کے طلبا اپنے محدود دائرہ عمل میں ہمیشہ اسی پر مُصر
رہتے تھے کہ اس انجمن کو تمام خارجی اثرات سے محفوظ اور اسکی آزاد حیثیت کو برقرار رکھیں
چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب رہنمایان ملک و ملت نے سرکاری اور امدادی اسکول و کالج
سے ترک موالات کرنیکی اپیل کی تو علی گڑھ کالج کے طلبا نے سب سے پہلے اس انجمن کے ذریعہ
سے وہ فیصلہ کیا تھا جو صفحات تاریخ پر زریں حروف سے لکھا جائیگا کہ اگر ارباب کالج نے
اس رقم کو جو حکومت سے بطور امداد کے لی جاتی ہے بند نہ کردی تو ایک مدت مقررہ کے

بعد یہ کالج مرکزی خلافت کمیٹی کے ماتحت قومی درسگاہ بنالی جائے گی، چنانچہ وہ شخص جسکی صدارت میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا آج ایثار و قربانی کا نمونہ بنکر طالبعلمی کے منازل طے کرتا ہوا اساتذہ کے حلقہ میں اسوقت بھی موجود ہے۔

حضرات! انجمن کی اُن خدمات سے قطع نظر کرتے ہوئے جو ترک موالاۃ کے سلسلہ میں اُسنے انجام دی تھیں میں صرف لبعد کے حالات اجمالاً بیان کرونگا اور اُسی پر اکتفا کرونگا۔

۱۳ راکتوبر ۱۹۲۰ء کو جب ایم۔اے۔او کالج کی عمارتین مُسلح پُولیس کے ذریعہ ہملوگوں سے خالی کرائی گئیں اور ہمیں مجبور کیا گیا کہ بورے اور بستر سمیت اپنے گھروں کو چھوڑ کر حدود کالج سے باہر دور ایک میدان میں کرایہ کی دو کوٹھیوں اور چند خیموں میں رہنے کا انتظام کریں اسوقت جو کیفیت ہمارے دل و دماغ کی پریشان حالی کی تھی اُسکا اندازہ اسوقت بھی شاید کیا جاسکتا ہے، تحفظ خلافت کیلئے جانثاری کا شوق ہمارے دلوں میں تہا، ناموس اسلام کی حفاظت کا خیال تہا، مظالم پنجاب کی یاد ابھی تازہ تھی اور حصول سوراج کا سودا ہمارے دماغوں میں چکر لگا رہا تہا، غرض سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں تہا" کالج کے چھُٹ جانے پر غم و غصہ تہا اسلئے کہ وہ قوم کے گاڑھے پسینہ کی کمائی تھی اور ہم اپنے کو اُسکا وارث اور جائز حقدار سمجھتے تہے۔ ان کیفیات کے ساتھ جہاں ہمنے اپنی آئندہ زندگی کیلئے نئے اُصول وضع کئے ہمنے کالج مرحوم کے اُن رسم و روایات کو بھی قائم رکھا جو اُسکی منافی نتہے۔ یونین کلب جو ہماری گذشتہ تیرہ و تاریک زندگی کا ایک روشن پہلو تہا اُسکا قیام اُن حالات میں بدرجہا ولی ضروری تہا۔ نائب صدر ہمارے ساتہ تھے۔ ایک ناظم اور چند ممبران کیبنٹ کی ضرورت تھی جنکا انتخاب، بلاتوقف کرلیا گیا۔ کئی ایک جلسہ بھی اس انجمن کیطرف سے منعقد کئے گئے لیکن "رامپور حامد ہال" کی چھت کے نیچے نہیں بلکہ درختوں کے سایہ میں، زمین کے فرش پر بیٹھکر اور اُس شخص کی موجودگی میں جسکے خیال سے بھی دشمنان اسلام کے دل لرز جاتے تہے۔

حضرات! اسی طریق پر اتحاد طلبہ کی کارروائیاں کئی مہینہ تک جاری رہیں اور بالآخر شروع مئی ۱۹۲۱ء میں سالار اعظم (مولانا محمد علی صاحب) کے حکم کے مطابق ہملوگ اس صبح ملک کے

مختلف مقامات پر بھیجدیے گئے اور ایک سال تک خلافت، انگورہ، سمرنا اور سوراج کیلئے دریوزہ گری کرنیکے بعد ہم میں سے اکثر لوگ پھر اسی محور پر کھنچ آئے جہاں سے روانہ ہوئے تھے لیکن بعض سرفروش ہستیاں ایسی بھی ہیں جو حکومت کے جور وستم کا نشانہ بنیں اور آج زندان فرنگ کی بہت سی بحر ایاغ کوٹھریوں میں اپنی زندگی کا قابل رشک زمانہ گذار رہی ہیں، ہمارے لیے باعث افتخار ہیں یقیناً یہ ہستیاں اور میں اساتذۂ جامعہ کی خدمت میں اس امر پر پھر ایک بار ہدیۂ مبارکباد پیش کرونگا۔

حضرات! اسی سنہ ۱۹۲۰ سے اب تک ہماری انجمن جن واقعات وحوادث کا شکار رہی ہے اُسکی ایک طویل داستان[۱] آپکے سامنے ابھی پڑھی جاچکی ہے، اسمیں شک نہیں کہ باوجود ہمارے اغماض اور بیتوجہی کے اور باوجود اساتذہ کی بے التفاتی کے جس جانفشانی سے ہمارے چند بھائیوں نے اس انجمن کو اب تک چلایا اُسکے لیے ہم میں سے ہر شخص کو اُنکا شکرگذار ہونا چاہیئے بہرحال انجمن کی گذشتہ روئداد سُننے کے بعد یہ کہنا بیجا ہوگا کہ آج ہم لوگ نئے سر سے اُسکی تنظیم اور ترتیب پر آمادہ ہیں، اب میں چند الفاظ انجمن کے اغراض و مقاصد کے متعلق بھی عرض کرنا چاہتا ہوں

حضرات! مجھے امید ہے کہ اس خیال میں آپ سب میرے ہم آہنگ ہونگے کہ ہماری "اتحاد طلبہ" کی کوئی غرض اور مقصد جامعہ کے اغراض اور مقاصد کے کسی حالت میں منافی نہیں ہے، بانی جامعہ مولانا محمد علی صاحب مدظلہ نے انفرادی حیثیت سے بھی ہماری زندگی کا وہی مقصد قرار دیا تھا جو ہیں جامعہ کا اجتماعی حالت میں ہے اور جسکی تعلیم شریعت اسلامی سے (ذرشرع سے) لبریز ہے یعنی "سچی اسلامی تعلیم کا عملی نمونہ بنکر مذہب و ملک کا خدمتگذار بننا" پس وہ تمام تدابیر اختیار کرنا جنکے ذریعہ سے ہم میں عملی قوت پیدا ہو، ہمارے خیالات میں وسعت ہو اور ہمارے ارادوں میں استقلال سب اس انجمن کے اغراض مقاصد میں شامل ہیں، تدابیر کی تعیین اور اُنکا طریق کار یہ وہ بحث طلب مسائل ہیں جنکی الجھن میں پڑنا تو چاہیئے لیکن چونکہ اس سے کوئی قطعی فیصلہ اسوقت نہیں ہو سکتا اسلئے تمام معاملات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس انجمن کے صرف ایک مقصد کے متعلق میں کچھ عرض کرونگا۔

---

[۱] یہ اشارہ ہے اس رپورٹ خطبہ کی طرف جسے انجمن کے سابق نائب صدر نے چند منٹ پیشتر پڑھکر سنایا تھا۔

برادران جامعہ! انسان کی تمدنی زندگی کا ایک بہترین اصول ہے کہ جب بہت سے کام ایک ہی وقت میں غور طلب ہوں تو سب سے پہلے اسی کیطرف توجہ کی جاتی ہے جسکی انجام دہی وقت کے لحاظ سے سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے چنانچہ میرے نزدیک انجمن اتحاد طلبہ کا اولین فرض اور مقصد اسوقت صرف یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اُن ذمہ داریوں کا حقیقی طور پر احساس کریں جو اس جامعہ کے حلقہ میں داخل ہو نیکے بعد ہم پر عائد ہوتی ہیں، ذمہ داریوں کی تشریح اجمالاً صرف اسیقدر کیجاسکتی ہے کہ ہم اپنے میں اسقدر صلاحیت پیدا کریں کہ اگر جامعہ کا بوجھ اساتذہ کے کاندھوں سے اٹھا کر ہم پر ڈالدیا جائے تو ہم اسکے متحمل ہو سکیں، اور ہر وقت جامعہ کی تمام کمزوریوں کو رفع کرنیکے لئے ہم بھی اسی طرح ساعی و کوشاں رہیں جسطرح ہمارے اساتذہ۔

حضرات! اس حقیقت سے آپ بھی واقف ہونگے کہ ہر تعلیم گاہ کے قیام کے لئے دو ہی عنصر سب سے زیادہ ضروری ہوا کرتے ہیں ایک اساتذہ کا حلقہ دوسرے طلباء کی جماعت اسی حیثیت سے دونوں کی ذمہ داریاں بھی مساوی ہوتی ہیں، لیکن اس کلیہ کا تعلق جہاں تک ہمارے جامعہ سے ہے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری ذمہ داریاں اساتذہ کی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ یہہ ہماری حسب سے بڑی خود فراموشی ہوگی اگر ہم اسکا اندازہ ابھی سے نہ کریں۔

آج سے چند سال پہلے ہم سب گو انحطاط و تنزل کی آخری منزل پر محو خواب تھے۔ اٹھتے بھی تھے تو قوم فروشی کی انجمن سے ہماری تعلیم کا آغاز ہوتا تھا جسکی تکمیل ہمارے لئے باعث عزت و افتخار سمجھی جاتی تھی اسکا خیال بھی نہ گذرتا تھا کہ ہمیں اپنی معصیتوں اور گناہوں کا کفارہ بھی کبھی دینا پڑیگا۔ غرض ہماری حالت پر اسکا مصداق ہو سکتا تھا کہ ع ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں آخر کار مظلومان قوم و ملت کی دردمند آہوں نے ہمیں بھی خواب غفلت سے بیدار کیا اور ہم لوگ شریعت کے بنائے ہوئے اُس صراط مستقیم پر گام زن ہوئے جسکے متعلق بجا طور پر یہہ کہا جاسکتا ہے کہ ؎

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریق عشق منزل اول است

برادران جامعہ! ہم لوگوں نے ترک موالات کے سلسلہ میں جسوقت اپنی پرانی تعلیم گاہوں کو چھوڑا تھا

ہماری آئندہ زندگی کے متعلق بہت سے امور کا فیصلہ اسوقت ہو گیا تھا خود غرضی اور خود نمائی کی تمام ناپاک آرزوؤں کو خاک میں ملا کر خود فروشی کا سودا اپنے سر لیا تھا، مذہب کی تبلیغ اور ملک کی آزادی کا بیڑہ اٹھایا تھا لیکن جب ایمان و استقلال کی آزمائش شروع ہوئی اور حوادث کی بجلیاں بھی چمکنے لگیں کہ ہمارے خرمن امید کو جلا کر خاکستر کر دیں ہمارے ساتھیوں میں سے غالب تعداد پھر انہیں ظلمتکدوں میں جا پھنس گئی جہاں کی سحر کاریوں نے ہمیں صدیوں تک بے حس اور تغافل شعار بنا رکھا تھا، اب ہزاروں کی تعداد میں سے چند نفوس باقی رہ گئے ہیں جنکے ذمہ فرائض ملکی اور مذہبی کی انجام دہی کا بوجھ آج بھی ڈالا گیا ہے اور کل اور پڑنے والا ہے۔ اگر اس جماعت کا بھی کوئی فرد کسی دوسری درسگاہ کی فلک بوس عمارتوں اور ظاہری ساز و سامان سے مرعوب ہو کر یہاں سے علیحدہ ہو جائے تو اس سے بڑھکر مذہب اور ملک کے ساتھ اسوقت اور کیا سرکشی ہو سکتی ہے؟

ہماری جامعہ باوجود اپنی بے سر و سامانی کے ہمارے خیالات کی نشو و نما دوسری تعلیم گاہوں سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور افضل طریقہ پر کر رہی ہے، لیکن اس سے متمتع نہ ہونا ہماری ہی غلطی ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہونا چاہیے کہ جو تعلیم گاہ اس حکم ربانی کی تعمیل کے لئے قائم کی گئی ہے کہ ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر (اور تم میں سے ایک ایسی جماعت چاہیئے جو نیک باتوں کی طرف لائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عامل ہو) اسکی کامیابی یقینی ہے ......

اساتذۂ کرام! میں اپنے فرائض سے سبکدوشی کے لئے تمام منازل طے کر چکا لیکن میرے سر سے بوجھ اسوقت اتر سکیگا جب میں اپنی آنیوالی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے چند گزارشات آپکی خدمت میں بھی پیش کر دوں۔

بزرگان محترم! آپنے گذشتہ چند ماہ کے عرصہ میں ہماری حالتوں کا بخوبی اندازہ کر لیا ہوگا ہمیں بھی اسکا احساس ہے کہ علمی نقطۂ نظر سے ہماری حالت آپکے لئے نہایت ہی امید شکن رہی ہے جسکے اسباب سے بھی شاید آپ بیخبر نہوں، اس پر آشوب زمانہ میں جب حق و باطل کی کشمکش ہے، حریت استبداد سے برسر پیکار ہے، کفر و اسلام کا مقابلہ ہے، جو کچھ کیفیت ہمارے دل و دماغ کی بے چینی اور پریشانی کی ہے وہی فطرت انسانی کا اقتضا ہے حصول علم کیلئے نہایت سکون اور اطمینان ازبس ضروری ہوتا ہے لیکن ہماری بدقسمتی سے آج انہیں چیزوں کا فقدان ہے۔ اپنی علمی کم مائیگی کا خیال کرتے ہوئے ہمیں تکمیل علم کا ذوق ضرور یہاں کھینچ لایا ہے۔ ہم آپکی خدمت میں بھی شریک

ہوتے ہیں لیکن جب ریوٹر کی تار برقیاں آئے دن ہمارے لئے یہی پیام لاتی ہیں کہ شیاطین یورپ کی خون آشام تلواریں محافظین اسلام کا کام تمام کر رہی ہیں اور خلافت رسول کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ جو باسفورس کے کنارہ پر رہ گیا ہے اسکو بھی بجھا کر عیسائیت کا فانوس روشن کرنیکی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ خود اپنے ملک میں بھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ چند معزز ہستیاں ہمارے قومی اور مذہبی احساسات و جذبات کو اس بیدردی سے پامال کر رہے ہیں تو آپکی طرح ہماری بھی بیچینی اور بیقراری کی کوئی انتہا نہیں رہتی پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ ہم میں سے اکثر لوگ جو ضمیر کشی پر طیار نہ تھے انہیں اپنے والدین اور سرپرستوں کی طرف سے وہ سزا ملی ہے جسکی چوٹ کو کوئی دردمند انسان نہیں برداشت کر سکتا۔

یہہ ہمارے سوز نہاں کی ایک پریشان داستان ہے اب اسکا فیصلہ آپ ہی بہتر کر سکتے ہیں کہ اگر ہم آپکی حسب منشاء علمی میدان میں کوئی نمایاں ترقی نہ دکھلا سکے تو ہم واقعی مجبور رہتے۔

بزرگان من! میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس جامعہ کے ساتھہ ہمارا تعلق صرف طالبعلم ہی ہونیکی حیثیت سے نہیں رہا ہے بلکہ ہملوگ جامعہ کی خدمت کو ہر ممکن طریقہ سے اپنی زندگی کا بہترین مقصد تصور کرتے ہیں اسلئے کہ اسمیں قوم کی آئندہ ترقی کا راز مضمر ہے۔ میں یقین کے ساتھہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم میں سے بہت سے طالبعلموں نے اپنا رشتۂ حیات ہمیشہ کے لئے جامعہ کے ساتھہ وابستہ کر لیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر آپ اس جامعہ کے معمار ہیں تو ہم اسکی اینٹیں ہیں اب ہملوگونکی یہہ آرزو ہے کہ جامعہ کی فلاح و بہبود کے تمام معاملات میں آپ ہمارے حسیات کا خیال رکھیں ہماری رایوں کو ٹھکرائیں نہیں بلکہ جامعہ کے انتظامات میں آپ ہمیں بھی اپنا شریک کار رکھیں یہہ ممکن ہے کہ ہمارے نارسا ذہن بڑی بڑی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں ناکام رہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ہماری رائیں صائب نہ ہوں اور صلاح و مشورہ دینیں کوئی قرینہ نہ پایا جائے لیکن پھر بھی اسلامی جمہوریت کی یہی تعلیم ہے کہ ہر شخص بچہ ہو، یا بوڑھا۔ تعلیم یافتہ ہو یا جاہل اگر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو سکتا ہے تو اسکو امور ملک کے متعلق بھی خلیفہ سے سوال کرنیکا حق ہے اور وہ صلاح و مشورہ دینے کا مجاز ہے۔

آخر میں مجھے اس امر پر آپکو مبارکباد دینا ہے کہ طلبائے جامعہ کی شیرازہ بندی

کی رسم آج آپکے مبارک ہاتھوں سے ادا ہو رہی ہے اور اب اس اعتراض کی گنجایش نہ رہےگی کہ ؎

رشتۂ الفت میں جب اُنکو پرو سکتا تہا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

انجمن اتحاد ملیہ کی مفصل سرگذشت ابھی آپکے گوش گذار کی گئی ہے جو یقیناً آپ قابل اطمینان نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اب اُمید ہے کہ آپکی توجہ اور سرپرستی میں اسکی اصلاح حسب منشا ہو سکیگی اور جس مقصد کے لئے یہ قائم کی گئی ہے اُسمیں کامیابی ہوگی۔

حضرات! مجھے جو کچھہ کہنا تہا عرض کر چکا۔ آپنے جس خاموشی اور اطمینان سے میری گذارشات سنیں اُسکا تہ دل سے مشکور ہوں۔ خدا مجھے اس قابل کرے کہ جو کام آج آپ میرے سپرد کر رہے ہیں اُسکو اپنے رفقاء کی مدد سے آپکی خواہشات کے مطابق انجام دے سکوں میں اپنی اس لکھی ہوئی تقریر اُس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ

اُٹھائے غم بہت بس شاد کر دے — فراغت دے ہمیں آزاد کر دے
غلامی اب نصیب دشمناں ہو — خداوندا ہمیں آزاد کر دے

شہیدِ حق

(۱)

بنا کردند خوش رسمی بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یوں تو حق کی حمایت کرنے والے، اور سچائی سے محبت رکھنے والے بیشتر ملیں گے لیکن وہ افراد کتنے ہیں جو حق کی دیوی کا کامل خراج ادا کرتے ہوں اور سچائی کی راہ میں جو مشکلات و مصائب آتے ہوں، ان کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے ہوں اور پھر ایسے افراد کتنے ہوں گے جن کی راہ حق میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آئیں! کم از کم دنیا کی موجودہ تاریخ حق کے اِن پاک مظاہروں سے خالی ہے اگرچہ قدرت کی تائید سے اب ہندوستان اس سطح پر آرہا ہے مگر حقیقی منزل ابھی بہت دور ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کو پانے کے لیے کتنے افراد صحیح معنوں میں بے تاب ہیں؟ مگر مسلمانوں کی گزشتہ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ ملت بیضا کے معمولی عاشقوں نے حق و راستی کی راہ میں وہ قربانیاں کی ہیں جن کا آج صرف تصور ہمارے جسموں میں رعشہ پیدا کر دیتا ہے۔

سعید ابن جبیرؓ ایک جلیل القدر تابعی تھے، اپنی حقگوئی کی وجہ سے سلطنت بنی امیہ کے سخت معتوب تھے۔ ان کے جور و ستم سے بچنے کے لیے عرصہ تک پوشیدہ اِدھر اُدھر پھرا کیے مگر اتنی بڑی عظیم الشان سلطنت سے کب تک اپنے کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ آخر ایک دن ایک فرقہ کے ذریعہ حجاج سفاک کے دربار میں پکڑ آئے، اس ظالم کے لیے اس سے بڑھکر کون ضیافت ہو سکتی تھی۔ اس نے غضب آلود نگاہوں سے سعیدؓ کا نام دریافت کیا آپ نے فرمایا "سعید ابن جبیرؓ" حجاج نے کہا۔ یہ کیوں نہیں کہہ کہتے کہ "شقی ابن کسیر"

سعید :- میری والدہ میرے نام کو تجھ سے بہتر جانتی تھی۔

حجاج :- (غصہ سے بیتاب ہوکر) تو اور تیری ماں دونوں کمبخت ہیں۔

سعید :- غیب کا علم تیرے سوا کسی اور کو ہے۔
حجاج :- اچھا دیکھو میں تم کو ان گستاخیوں کا مزہ چکھاتا ہوں۔
سعید :- اگر مجھے یہ علم ہوتا کہ تکلیف و آرام کا مالک تو ہی تو میں خدا کو چھوڑ کر تجھی کو اپنا معبود قرار دیتا۔

حجاج ان ترش جوابات سے عاجز ہو کر اب سعیدؓ کو کسی دوسرے شکنجہ میں لانا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے فوراً موضوع سخن بدلا اور مذہبی سوالات کی بوچھار شروع کر دی، جو سیاسی پہلو لیے ہوئے تھے۔

حجاج :- آنحضرت صلعم کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟
سعید :- آپ خدا کے پیغمبر اور دنیا کے سچے ہادی تھے۔
حجاج :- اچھا خلفاء کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟
سعید :- میں ان کا قاضی نہیں۔
حجاج :- تم کس خلیفہ کو فضیلت دیتے ہو؟
سعید :- جو خدا کی خوشنودی کا سب سے زیادہ پابند تھا۔
حجاج :- تو پھر تمھارے نزدیک یہ درجہ کس کا تھا؟
سعید :- اس کا علم اس ذات کو خوب ہے جو لوگوں کے راز اور ان کی سرگوشیوں سے واقف ہے۔

حجاج نے ہر چند چاہا کہ کوئی بہانا قتل کا ہات آئے مگر سعیدؓ کی دلیری و صاف گوئی نے اس کا موقع نہ دیا لیکن غصہ و غضب سے حجاج کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آخر میں جب اس بھوکے شیر سے کچھ نہ بن پڑا تو صاف صاف یہ کہدیا

(۲)

حجاج :- (غصہ سے بیتاب ہو کر) اب پسند کر لو کہ میں تم کو کس طرح قتل کروں۔

سعید :- حجاج ! تو اپنے لیے پسند کر۔ خدا کی قسم جس طرح تو مجھے قتل کرے گا اسی طرح خدا تعالیٰ تجھ کو قتل کرے گا۔

حجاج :- تو کیا تمھیں معاف کر دوں ؟

سعید :- عفو خدا کے اختیار میں ہے۔ تیرے قبضہ سے یہ باہر ہے۔

آخر سنگدل حجاج نے اس مسلسل بحث کے بعد جلادوں کو حکم دیا کہ وہ باہر جا کر حضرت سعید کو قتل کر دیں۔

حضرت سعید جب باہر تشریف لائے تو ایکبار ہنسے۔ ہنسنے کی آواز حجاج کے کانوں تک پہنچی اس نے پھر بلا کر سعید سے ہنسنے کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا "خدا کے مقابل تیری جرأت وہمت اور تجھ پر خدا کا غیر معمولی حلم دیکھ کر حیرت ہوئی" حجاج نے اس جملہ سے اور غضبناک ہو کر جلادوں کو اپنے سامنے سعید کے قتل کا حکم دیا۔

اب پیکر حق پوری مستعدی کے ساتھ شرف شہادت کے لیے آگے بڑھتا ہے اور خدا کے سامنے قبلہ رو ہو کر فرماتا ہے "میرا منہ اس ذات کی طرف ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیا۔ میں صرف ایک ذات کی طرف مائل ہوں۔ اور میں مشرکین کے زمرہ سے نہیں ہوں"۔ حجاج نے جلادوں کو حکم دیا کہ "سعید کا منہ قبلہ کی جانب سے پھیر لیا جائے"۔ آپ نے فرمایا اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللہِ یعنی جس طرف تم ہو گے اسی سمت خدا کی ذات ہو گی۔

حجاج نے جلکر کہا کہ "اب سعید کا منہ اوندھا کر دو" خدا کا پیارا عاشق اب بھی خاموش نہیں ہے۔ اس مرتبہ اس کی زبان حق سے یہ پاک آیت ادا ہوتی ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى یعنی ہم نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اسی میں لوٹائیں گے اور اسی سے ایک بار پھر نکالیں گے۔

حجاج آپ کی سیف زبانی سے عاجز آکر جلادوں کو فوراً قتل کا اشارہ کرتا ہے۔

آپ کی زبانِ حق سے آخری آواز کلمۂ طیبہ کی بلند ہو رہی تھی کہ جلاد کا ہاتھ اُٹھا اور سر تن سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قتل کے بعد آپ کے جسم سے خون معمول سے زائد نکلا اور جوش مارتا ہوا۔ حجاج نے اپنے طبیب سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ "اس شخص کا دل بیحد مطمئن تھا۔ آخر وقت تک کسی قسم کا خوف و ہراس نہیں ہوا اس لیے کہ جو شخص خوف زدہ ہوتا ہے اس کے جسم کا خون خشک ہو جاتا ہے اور اس میں وہ تیزی یا جوش باقی نہیں رہتا" یہ واقعہ شعبان ۹۵ھ کا ہے اور اسی کے بعد رمضان میں حجاج بھی راہیِ ملکِ عدم ہوا۔

گُروکُل

گُروکُل اپنی نوعیت کی وہ یگانہ اور بے نظیر درس گاہ ہے۔ جس کے اغراض و مقاصد اور حالات بیان کرنے سے بیشتر کسیقدر تفصیل سے یہ بتانا ضروری ہے، کہ اس نے کس عہد کی تعلیم اور کن علوم کے احیاء و بقا کو اپنے پیش نظر رکھا ہے؟ اور یہ کیوں؟

ہندوستان کا تعلیمی دَور

تم کسی ملک کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو، اس کے علوم و فنون اور تعلیم و تدریس کے مختلف اَدوار پاؤ گے۔ اس بنا پر ہندوستان کی علمی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک کی تعلیم اور اس کے علم و فن پر چار بڑے بڑے دَور گذر چکے ہیں جو اپنی خصوصیت کے لحاظ سے باہم مختلف ہیں۔ اِن کے ذکر کرنے میں یہ بتعیین طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ ایک دُور کس سال ختم ہوتا ہے اور دوسرے کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ لیکن ایک مخصوص زمانہ ایسا ہوتا ہے جب ایک دَور میں تنزل و انحطاط شروع ہوتا ہے تو دوسرا تقویت و عروج پاتا نظر آتا ہے۔ اور کچھ عرصہ بعد ایک معدوم یا تقریباً معدوم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا اپنے عین شباب پر ہوتا ہے۔ ایسا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے جب کم و بیش ہر دَور کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی تعلیم کا پہلا دَور وہ تھا جب ہندوستان کیا باعتبار علم و فن اور کیا بلحاظ تہذیب و تمدن تمام دنیا کے لئے شمعِ راہ تھا۔ بابل و نینوا کی تہذیب خاک میں مِل چکی تھی، یونان و مصر کے عروج کا نام و نشان

نہ تھا۔ اسوقت ہندوستان کی شمع تمدن اور ضیائے علم وفن سارے عالم پر پرتوفگن تھی، آبادی کا ایک مخصوص حصہ (برہمنوں کا طبقہ) علمی تحقیق وتفتیش کے لئے وقف تھا، زندگی کے دوسرے مشاغل صنعت و تجارت، سپہ گری و ملازمت سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ سنسکرت، وید، فلسفہ، الہیات منطق، طب، ہیئت اور ریاضی کی اعلےٰ تعلیم ہوتی تھی، لیکن کہاں؟ سربفلک عمارتوں میں نہیں، آراستہ و پیراستہ کمروں میں نہیں۔ بلکہ دریا کے کنارے کسی پہاڑی کے نیچے فرش زمین پر، یا کسی پُرسکون جنگل میں درخت کے سایہ تلے۔ طلبا اور اساتذہ آٹھوں پہر ساتھ رہتے، تعلیم کے معاوضہ میں زر و سیم شامل نہ تھے، طرز تعلیم قول سے بڑھکر خود گروجی کا عمل ہوتا، کتاب کے لئے کاغذ کے اوراق کی بجائے صحیفۂ فطرت کھُلا تھا۔ نالندہ (بہار میں) اور ٹکسلا (راولپنڈی کے قریب) کی عظیم الشان درس گاہیں اس تعلیم و تدریس کا مستقر اور ان علوم و فنون کا مرکز تھیں۔

اس کے بعد دوسرے دور کا آغاز اسوقت سے ہوتا ہے جب فتوحات اسلامی کا سیلاب ہندوکش سے گزر کر ہندوستان میں آپہنچا۔ اور مسلمان جنھوں نے ایک طرف یورپ افریقہ کو بیدار کیا تو دوسری جانب علم وفن کی دولت لیکر ہندوستان میں اُتر آئے۔ اور ایک نئی تہذیب اپنے ساتھ لائے۔ پچھلے دور کی خصوصیات رفتہ رفتہ مٹنے لگیں، علم کسی طبقہ یا جماعت سے مخصوص نہ رہا، دریا و صحرا کی کٹیوں کے بجائے مزیّن و مرصع دربارِ علم لگتا، سنسکرت و بھاشا کی جگہ عربی و فارسی نے لے لی، ہندوستان کے فنونِ لطیفہ کا عروج اسی دور میں ہوا۔ شعر و شاعری، نغمہ و سرود، نقاشی و مصوّری، سنگ تراشی و پچیکاری، کتابت و خوشخطی ان میں سے بعض نے اس دور میں آنکھ کھولی اور اکثر نے اِس عہد

میں وسعت نظر پائی۔ اہل علم اور ماہرین فن بادشاہ یا نواب کی سرپرستی میں اپنے کمالاتِ فن پیدا کرتے تھے۔ مکتب یا مدرسے بھی عموماً وہیں ہوتے تھے۔ جہاں حکومت کے پایۂ تخت ہوتے تھے، دہلی، لکھنؤ، اور احمد آباد دارالحکومت بھی تھے اور مرکزِ علم وفن بھی، بڑے بڑے محققینِ علم وفن یہیں سے اُٹھے۔

تیسرا دور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ آتا ہے۔ جو اپنی غیر ملکی خصوصیات اثرات کے لحاظ سے سب سے زیادہ موثر ثابت ہوا۔ ان حکمرانوں نے ہندوستان کو کبھی اپنا گھر نہیں سمجھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی ہر شئے انکو غیر و بیگانہ نظر آنے لگی۔ اپنی زبان، اپنے علوم وفنون، اپنی تہذیب ومعاشرت کا رواج دینا انہوں نے اپنا فرض جانا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بڑی کوشش یہ کیگئی کہ حکومت کی زبان انگریزی ہو اور علوم وفنون بھی زیادہ تر مغربی پڑھائے جائیں، جہانتک ہوسکا ایشیائی علوم وفنون کی عسرت دبے مایگی بیان کی گئی۔ اور اسکے مقابل مغربی علوم وفنون کی فراوانی ومحاسن کی تعریف میں دفتر کے دفتر کھولدیئے گئے۔ لارڈ میکالے صدر نشین مجلس تعلیمات نے کونسل میں اپنی جو مشہور یادداشت پیش کی تھی اسمیں ایک جگہ لکھا ہے "کہ مستشرقین یورپ میں سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکا کہ یورپ کے کسی اچھے کتبخانہ کی ایک الماری کی کتابیں قدر وقیمت میں ہندوستان وعرب کے سارے علم وادب کے برابر ہیں" انگریزی زبان کی مدح سرائی میں موصوف نے اس طرح رطب اللسانی کی ہے "جو شخص انگریزی جانتا ہے وہ دماغ انسانی کی اس بے حساب دولت تک رسائی رکھتا ہے جسے نوسے پشت میں کرۂ ارض کی سب سے عاقل قوموں نے پیدا اور جمع کیا ہے" غرض ایسی اور دیگر اس قسم کی مبالغہ آمیز غلط بیانیوں سے ہندوستانیوں کے دلوں میں انکے علوم وفنون کی طرف سے نفرت اور بےاعتنائی

پیدا کی گئی۔ علاوہ اس کے انگریزی حکومت کی زبان ہونے کی وجہ سے لوگوں کو سرکاری ملازمتوں کے حاصل کرنے کے لئے خواہی نخواہی انگریزی سیکھنے کی طرف ترغیب ہوتی تھی، نیز حکومت کے محرر اور عملے تیار کرنے کے لئے اسکول اور کالج کا کھولنا ضروری ہوا جنہیں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم قرار پائی اور مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ ان ساری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان مشرقی تہذیب سے یکسر ناآشنا ہوگیا۔ اور مغربی تمدن کے رنگ میں رنگ گیا، مشرقی علوم و فنون سے لوگ بیگانہ ہو گئے، انگریزی زبان و ادب سیکھنا اپنے لئے مایۂ افتخار سمجھا۔

گروکل کا قیام

انہیں حالات میں سوامی دیانند جی پیدا ہوئے جنھوں نے دیکھا کہ علوم مغربی کی روزافزوں ترقی ہندوستان کے شاندار ماضی کو محو کرتی جاتی ہے اور قدیم علوم و فنون کے عروج کو لوگ اب قصۂ ماضی سمجھنے لگے ہیں، یہی حالت اگر کچھ اور باقی رہی تو ہندوستان کی اس تہذیبِ قدیمہ کا کوئی نام لیوا بھی باقی نہ رہ جائیگا۔ لہذا ایک ایسی درسگاہ کی ضرورت ہے جو دورِ اولے کی روایات اور تہذیب و معاشرت کو زندہ کرے اور وید و سنسکرت کے علوم کو باقی رکھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں سوامی دیانند جی کو خیالات کو عمل میں لانے کے لئے لاہور میں ایک کالج قائم کیا گیا جو آج دیانند اینگلو ویدک کالج کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ۱۸۹۱ء میں منتظمین میں یہ اختلاف پیدا ہوا کہ آیا تعلیم میں انگریزی اور سائنس کو طرۂ امتیاز حاصل ہو، یا وید اور سنسکرت کو؟ جو لوگ موخرالذکر خیال کے حامی تھے وہ کالج کے نظام سے مجبوراً علیحدہ کر دیئے گئے اور انگریزی و سائنس مرجح قرار پائی۔ اس علیحدہ شدہ جماعت کے سالارِ اعظم سوامی شاردھانند یا عرف عام

ہیں منشی رام تھے۔ اُنھوں نے سوامی دیانند کے مسلک کی نشر و اشاعت بذریعہ تبلیغ شروع کی لیکن آخر میں انہیں بھی ایک ایسے مدرسہ کی ضرورت ہوئی۔ جو ویدک کی خالص تعلیم کی بنیاد پر قائم ہو چنانچہ اُنھوں نے ۱۲ بچوں کی چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اس درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھا جو ہمارے اس مضمون کی زیب عنوان ہے۔ اور یوں سوامی دیانند کے خیالات کی حقیقی عملی تصویر ظہور پذیر ہوئی۔

اغراض و مقاصد سطور بالا سے یہ صاف طور پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ اس درسگاہ کے وجود میں آنے کی اصلی وجہ ہندوستان کا اپنے عہد ماضی سے بیگانگت اور اپنے قدیم علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ناآشنائیت ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ موجودہ ہندوستان کا اپنے مرکز اصلی سے یہ بُعد اور خود فراموشی کس طرح یکے بعد دیگرے مختلف ادوار سے گزرتا ہوا عمل میں آیا۔ اور ہر دور نے کیا کیا خصوصیات و اثرات پیدا کئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اصلی مقصد کو پہنچے اور اسی دورِ اولیٰ کی طرف رجوع کیا اور اس عہد کا احیاء و بقا اپنے پیش نظر رکھا۔ اسکے بانی منشی رام نے تو صاف طور یہ کہا ہے کہ "اس درس گاہ کے پیش نظر ہندوستان کی قدیم یونیورسٹی ٹکسلا کا نمونہ ہے"۔ اسکی اولین غرض یہ ہے کہ "ویدک تہذیب کو نشو و نما دیجائے اور انسانیت کے سامنے مادیت و زر پرستی کی بجائے روحانیت اور وید مقدس کی تعلیم پیش کیجائے"۔

نصاب تعلیم کسی درس گاہ کے مقاصد کا پتہ ایک بڑی حد تک اس کے نصاب تعلیم سے چل سکتا ہے۔ گروکل نے اگرچہ ہندوستان کے قرن اولیٰ کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ لیکن اس سے اسکی غرض کورانہ قدامت پرستی نہیں ہے علوم قدیمہ کے ساتھ ساتھ اس نے علوم جدیدہ بھی رکھے ہیں

طرز تعلیم میں وقت کی پابندی، نظم و ترتیب، نیز دیگر ضروریات تعلیم کا بھی بدرجہ اولیٰ لحاظ رکھا گیا ہے۔ صرف دماغی نشو و نما مقصود نہیں بلکہ اخلاق کی اعلیٰ تعلیم بھی دیجاتی ہے، اور جسمانی ترقی کا بھی سامان مہیا کیا گیا ہے۔

نصاب تعلیم چودہ سال کا ہے۔ جسمیں وید اور جدید سنسکرت خاص طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ انگریزی زبان و ادب اور دیگر علوم جدیدہ بھی شامل تعلیم ہیں۔ فی الحال وید، ادب انگریزی، ریاضی، کیمیا، فن زراعت، طب، منطق، علم النفس، علم الاخلاق، مابعد الطبعیات، تاریخ، معاشیات، جغرافیہ، ڈرائنگ اور دینیات کی تعلیم دیجاتی ہے، ایک مجلس تعلیمی کی زیر نگرانی تعلیمی اسکیم کی نظر ثانی ہوتی رہتی ہے تاکہ دنیائے علم کی تازہ تحقیقات سے طلبا مستفید ہوتے رہیں۔

ان کے علاوہ طلبار کی اخلاقی تعلیم کا بہترین مکتب دار الاقامہ قرار پایا ہے۔ بورڈنگ یا دار الاقامہ کا طریقہ تمدن جدیدہ کی کوئی نئی برکت نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کا یہ ایک جزو نمایاں رہا ہے۔ طلبا ہمیشہ اپنے گروؤں اور اساتذہ کے ساتھ جنگلوں میں بکجا رہا کرتے تھے۔ لہٰذا اسی طریقہ پر آج بھی وہ اس درس گاہ میں اساتذہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ جو انکی ہر طرح کی اخلاقی نگرانی رکھتے ہیں۔ ایک وقت معینہ پر انکو عبادت کے لئے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے اور ہر کام میں اس پابندی و نظم کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس طرز زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ طلبا میں خودداری، دیانتدار بھائی چارہ اور انسانی ہمدردی کے اوصاف حسنہ پائے جاتے ہیں۔

گروکل آبادی سے دور ایسے مقام پر واقع ہے کہ قدرتاً بہت سے خوشنما میدان نکل آئے ہیں جنمیں طلبا، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال کھیلتے ہیں، لیکن اسکے ساتھ وہ ہندوستانی کھیلوں کو بھلا نہیں بیٹھے ہیں۔ چنانچہ وہ کبڈی بھی کھیلتے ہیں اور

دوسری قسم کی ورزشیں بھی کرتے ہیں۔ جن میں، پیرنا، کُشتی لڑنا شامل ہے۔ اِن سب ورزشوں میں طلبا کی شرکت کی سخت تاکید ہے۔

کتب خانہ کسی درس گاہ کی وسعت وعظمت کا اندازہ اس کے ان متعدد شعبوں سے ہو سکتا ہے جو آجکل جزوِ تعلیم بنگئے ہیں۔ چنانچہ ہم ان میں سے ہر ایک کا ذکر بالاختصار کرتے ہیں۔ کالج کی وسطِ عمارت میں ایک بلند کشادہ کمرہ کتب خانہ کے لئے ہے اس میں الماریوں کی دو قطاریں ہیں۔ ایک جانب بالکل سنسکرت کی کتابیں ہیں۔ جو تعداد میں تقریباً گیارہ ہزار ہیں۔ انکے علاوہ انگریزی کی بھی مستند کتابیں ہیں۔ تاریخ وسِیَر کا کافی ذخیرہ موجود ہے۔ کتب خانہ کی ترتیب جدید طریقہ (یعنی ڈسمل سسٹم آف کلاسفیکیشن) پر ہوئی ہے۔ ہر مضمون کی کتاب بہ لحاظ حروف تہجی مرتب ہے۔

دار المطالعہ کتب خانہ کے عین وسط میں ایک بڑی میز ہے۔ جسپر روزانہ وہفتہ وار اخبارات، اور علمی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی رسالے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ اخبارات ورسائل متعدد زبانوں میں ہوتے ہیں۔

تجربہ گاہیں یا معامل اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ یہاں سائنس کی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔ اراکین کالج کا خیال ہے کہ سائنس ممدِ تعلیم ہے نہ کہ دشمن تعلیم اس لحاظ سے طلبا کے عملی تجربے حاصل کرنے کے لئے متعدد معامل (تجربہ گاہیں) ہیں۔ ان میں ایک معمل الطبعیات ہے۔ جسمیں تمام ضروری آلات وسامان نیز سائنس کے نقشے (چارٹ) بھی موجود ہیں۔ ایک عمدہ خوشنما معمل الکیمیا بھی ہے۔ یہاں عملی تجربہ کا معیار اور یونیورسٹیوں سی نسبتہً بلند ہے۔ ایک معمل النباتات ہے جس میں خوردبین نیز دیگر ضروری سامان فراہم کئے گئے ہیں

اِن تمام معامل تک طلبا کی دسترس ہے اور وہ نہایت آزادی سے ہر چیز کو اپنے کام میں لاتے ہیں۔ ایام تعطیل میں بھی وہ ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ بعض مسائل میں تحقیق و تفتیش کا کام بھی کرتے ہیں۔

طلبا کے قوائے مشاہدہ و فکریہ کی نشوونما کے لئے گروکل کی طرف سے ایک کنڈر گارٹن بھی کھولا گیا ہے۔ اسمیں طلبا کو بجائے حرف و لفظ کے مشاہدہ و خیال کے ذریعہ تعلیم دیجاتی ہے اور ہر شئے ان کے سامنے تصویر اور نقشے کے ذریعہ سے پیش کیجاتی ہے۔

انجمنیں و رسائل اسکے بعد انجمنوں کا نمبر آتا ہے۔ یہاں متعدد انجمنیں ہیں۔ ایک سنسکرت کی ترقی کے لئے ہے جسکا جلسہ ہفتہ وار ہوتا ہے تمام تقریریں سنسکرت زبان میں ہوتی ہیں۔ ایک دوسری انجمن ہندوستان کے قدیم علوم اور تاریخ کی نشر و اشاعت کا کام انجام دیتی ہے۔ اسی سے متعلق ایک مخصوص مجلس ہے جو علمی تحقیق و تفتیش کا کام کرتی ہے۔ اس بڑی انجمن کا سالانہ جلسہ گروکل کے جلسہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اسمیں علمی، تاریخی اور فلسفیانہ مضامین پڑھے جاتے ہیں۔ اسکی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انجمن ہر سال مشاہیر ملک کو اپنے ہاں دعوت دیتی ہے تاکہ ان کے خیالات سے طلبا فائدہ اٹھائیں ایک انجمن اساتذہ کی بھی ہے جو اپنا جلسہ ہر ماہ میں دو بار منعقد کرتی ہے۔ اور اسمیں طریقۂ تعلیم پر بحث ہوتی ہے۔ تاکہ طلبا کو تعلیم دینے کا بہترین طریقہ اختیار کیا جائے۔

قوتِ تقریر کی ترقی کے ساتھ تحریری پہلو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ گروکل کی طرف سے ایک رسالہ نکلتا ہے۔ جسمیں طلبا اپنے مضامین دیتے ہیں۔ اسکے علاوہ خود طلبا کے متعدد پرچے نکلتے ہیں۔ جنمیں سنسکرت کے مضامین اور نظمیں ہوتی ہیں طلبا تصویر کشی اور نقشہ کشی کی مہارت بھی انہیں رسائل کے ذریعہ کرتے ہیں۔

تصنیف و اشاعت یونیورسٹی کا ایک بڑا کام اشاعتِ علم ہوتا ہے۔ ہر بڑی یونیورسٹی مختلف علوم و فنون پر جدید کتابیں اور قدیم لٹریچر جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے مردہ ہو جاتے ہیں۔ سال بہ سال شائع کرتی رہتی ہے۔ اس بنا پر انگریزی لٹریچر اور ایک حد تک مشرقی علوم بھی آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے بہت زیادہ ممنونِ احسان ہیں۔ گروکل بھی سنسکرت نیز آئین علوم کی نشر و اشاعت میں برابر کوشش کر رہی ہے اور ابتک متعدد تصانیف وہاں سے نکل چکی ہیں اور بعض زیرِ تالیف ہیں تاریخ ہندستان قدیم حصہ اول از پروفیسر رام دیو۔ ایم۔اے۔ سنسکرت زبان میں چھپکر شائع ہو چکی ہے۔ اسکے بقیہ ۲ دو حصے زیرِ تالیف ہیں۔ ابھی حال میں مصنف موصوف کی ایک اور تصنیف "پُران پوچن،، کے نام سے نکلی ہے۔ سائینس کی اکثر کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ سنسکرت کی کتاب الدروس (پرائمر و ریڈر) یہیں تیار ہوئی ہے جو اکثر اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ پروفیسر رام سرن سکسینا، ایم۔ایس۔سی نے علم الکیمیا کی تشریح پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جو ہندی زبان میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

طلبا ابتک ہمنے گروکل کی تعلیم اور اس کے نظام سے بحث کی ہے وہاں کے طلبا کا جو یونیورسٹی کے مساعی جمیلہ کا عملی نتیجہ ہوتے ہیں۔ کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ سچ یہ ہے کہ طلبا ہر درسگاہ کے شمعِ محفل ہوتے ہیں، اسلئے انکا تذکرہ ایک علیحدہ عنوان سے کرنا مناسب سمجھا گیا۔

گروکل میں طلبا، کی مجموعی تعداد ۴۰۷ ہے۔ جنمیں ۱۴۱ کالج میں اور ۲۶۰ اسکول میں ہیں۔ طلبا عموماً ۷ یا ۸ برس کی عمر میں داخل کئے جاتے ہیں اور ۱۶ برس تک یہیں مقیم رہتے ہیں۔ داخلہ کے وقت طلبا کو یہ حلف لینا پڑتا ہے

کہ وہ مفلسانہ پاک اور اطاعت گزار زندگی بسر کریں گے"۔ اس طویل مدت میں انھیں براستثنائے اشد ترین ضرورت، مکان جانے کی اجازت قطعی نہیں ہوتی۔ ان کے اعزہ و رشتہ دار بھی مہینہ میں ایک بار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور عموماً سال میں دو بار ملنے آتے ہیں۔ طلبا کے اس طویل اور مسلسل قیام کی وجہ سے اراکین گروکل کو ان کے اخلاق و عادات کی اصلاح کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ طلبا اوقات تعلیم نیز خارجی اوقات میں خاص نگرانی میں رہتے ہیں اساتذہ کے علاوہ ۱۳ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ گروکل کی فضا طلبا کے باہمی اتفاق و اتحاد اور ہمدردی و محبت سے بھری ہوئی ہے، طلبار کے یہ جذبات محبت و احترام اساتذہ کے ساتھ عموماً اور منشی رام کے ساتھ خاص کر بہت قوی ہوتے ہیں۔ طلبا میں یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ سب ایک کنبہ کے بچے ہیں اور آپس میں بھائی بھائی ہیں انہیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اپنی مسرت و خوشی میں دوسروں کو بھی شریک کرو۔ اور دوسروں کے غم میں خود شریک ہو۔ جب انکے والدین یا اعزہ ان سے ملنے آتے ہیں تو وہ اپنے لئے انفرادی طور پر کوئی مخصوص تحفہ نہیں قبول کرتے۔ اگر انمیں سے کسی کو ایک سیب دیا جائے تو وہ کہے گا "مجھے سیبوں کا ایک ٹوکرہ چاہیئے تاکہ میں سب دوستوں میں تقسیم کرسکوں"۔ باہمی محبت و ہمدردی کا یہ حال ہے کہ جب انمیں سے کوئی بیمار پڑتا ہے تو باری باری سے سب اُسکی تیمارداری کرتے ہیں۔ انکا معمول یہ ہے کہ صبح ۴ بجے گھنٹہ بجتے ہی وہ اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نصف گھنٹہ ورزش کرتے ہیں، نصف گھنٹہ میں غسل سے فراغت پاتے ہیں، پھر اس کے بعد صبح کی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بقیہ دن بھر لکھنے پڑھنے کا شغلہ رہتا ہے، شام کو پھر ایک بار سب اپنی عبادت میں لگجاتے ہیں۔

قیام و عمارات[1] یوں تو گروکل کے متعدد شعبے اندرونی نظام، طرز تعلیم، طلبار کے

حالات قابل ذکر تھے ہی لیکن اس کے خارجی حالات بھی کچھ کم دلچسپی نہیں رکھتے گروکل ضلع ہردوار کے ہندوؤں کا جو مقدس مقام ہے) ایک موضع کانگڑی میں واقع ہیں۔ اسیوجہ سے اسکو اکثر گروکل کانگڑی کہتے ہیں۔ یہ موضع کوئی ۲۰ ہزار روپے کی قیمت کا ہے جسے پنجاب کے ایک فیاض شخص نے وقف کر دیا ہے دریا گنگا اس کی داہنے جانب لہریں مارتا ہوا بہتا ہے، ہمالیہ کے دامن میں ہونیکی وجہ سے سطح زمین بلند ہے۔ اس لئے یہاں کی آب وہوا نہایت خوشگوار اور فرحت بخش ہے، دریا کا قرب اور پھر پہاڑ کا دامن اور اسپر قدرتی مناظر یہ ایسی چیزیں ہیں۔ جو ممکن نہیں کہ طلبا کے دل ودماغ پر خدائے تعالیٰ کی صنعت و کاریگری کا گہرا اثر نہ ڈالتی ہوں۔ اور جن سے محظوظ ہو کر طلبا ایک طرف اگر اپنی تعلیم میں مصروف رہتے ہوں، تو دوسری جانب اس سے متاثر ہو کر اس صانع قدرت کی یاد میں بھی ہمہ تن محو ہوتے ہونگے۔

اسکول کے سامنے ایک خوشنما باغ ہے۔ جس میں ترکاریاں اور فواکہات خوب پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بٹانیکل گارڈن بھی ہے۔ اسمیں رنگ برنگ کے پھول اور پھل ہوتے ہیں۔

اسکول کی عمارت فی الحال عارضی ہے۔ لیکن جدید عمارت زیر تعمیر ہے اُنکے علاوہ اساتذہ اور سپرنٹنڈنٹ کے لئے متعدد عمدہ کمرے ہیں۔ کالج کی عمارت ۴۰ ہزار روپے کی ہے۔ اسمیں ۲۲ کمرے ہیں۔ جنمیں کتب خانہ اور معامل بھی شامل ہیں۔ ایک جانب شعبہ کیمیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسری طرف شعبہ زراعت کی عمارتیں ہیں، بالائی منزل پر ایک عجائب خانہ (میوزیم) ہے۔ کالج کا دارالاقامہ بھی بنگیا ہے۔

گرُوکل کی خصوصیات

ہندوستان کے تین تعلیمی دَور کا ذکر ہم کر چکے ا چوتھے دور کا آغاز اسی گرُوکل کے قیام سے ہوتا ہے۔ جبکہ لوگ بہت زیادہ اپنے دلوں میں تعلیم کی طرف سے ایک بےچینی سی محسوس کرنے لگے۔ اس دَور کی تمام تعلیم گاہوں کی مشترک خصوصیات یہ ہیں کہ حکومت کے اثر و امداد سے آزاد رہنا چاہتی ہیں، مشرقی تہذیب و علوم کا مظہر ہوتی ہیں۔ مذہبیت کا عنصر غالب ہوتا ہے اور یہ سب خصوصیات اس درسگاہ میں پائی جاتی ہیں، جسے اس دَور کی اولیت کا فخر حاصل ہے۔

ہندوستان کی یہ غالباً واحد درسگاہ ہے جہاں طلبا کا قیام ۱۶ برس کی طویل مدت تک لازمی ہے۔ اس عرصہ میں طلبا ہر خارجی اثر سے بالکل محفوظ رہتے ہیں اور جس رنگ میں یہ درسگاہ انہیں رنگنا چاہے رنگ سکتی ہے۔ اسقدر تجرد و تزہد کی زندگی شاید طلبا اور کہیں نہیں بسر کرتے ہیں۔ اس بنا پر اگر تعداد تھوڑی ہے تو قابل افسوس نہیں۔

اگر کوئی باہر سے ہندوستان میں صرف اس غرض سے آئے کہ ہندوستانی تہذیب اور مشرقی علوم کا مظہر دیکھنا چاہیے تو بتاؤ وہ کہاں پائیگا؟ کارخانوں اور ملوں میں؟ یا سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں؟ نہیں بلکہ اگر سے دیکھنا ہے تو آئیے اور گروکل میں دیکھیے۔

اخیر میں جائے قیام اور ماحول کے لحاظ سے بھی اسے کچھ کم فضیلت نہیں۔ ہردوار ہندؤں کا سب سے مقدس اور قدیم مقام ہے۔ اس کے علاوہ مناظر قدرت کیلئے گنگا کا قرب اور ہمالیہ کا دامن اس کے ثبوت کیلئے کافی ہے۔

شذرات

"جوہر میں سیاسیات حاضرہ اور مسائل جامعہ کے متعلق وقتاً فوقتاً جو نوٹ شذرات کے عنوان سے نکل رہے ہیں، ان میں سے چند آپ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں جن سے رسالہ کا صحیح اندازہ ہوسکیگا۔"

(۱) آغاز جوہر

ہمارے پرچہ کی ابتداء الرشید کے نام سے ستمبر ۱۹۲۱ء میں ہوئی لیکن جنوری ۱۹۲۲ء میں بہ تقاضائے حسن عقیدت اُس ذات گرامی کے نام پر جو آج بیجاپور جیل میں قید کی کٹھن منزلیں کاٹ رہی ہے، اس کا نام بدل کر جوہر رکھا گیا اور سچ یہ ہے کہ اس تاریخ سے اس کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ آج یہ اپنی عمر کے تقریباً دس مہینے گزار چکا لیکن اس مدت میں وہ جس پابندی اوقات اور حسن و خوبی سے رہا ہے اس کی داد ہر شخص نے دی اور آج بھی اس کے پچھلے نمبر ان اوصاف پر دال ہیں اس طویل عرصہ میں وہ کبھی کسی تعطیل کے بہانہ سے بھی اپنے ناظرین کی خدمت سے غیر حاضر نہیں ہوا، ہاں صرف دو بار وہ اپنے مقررہ ہفتہ پر نہ نکل سکا لیکن اس کمی کو اس نے اپنی اگلی اشاعت میں ڈبل نمبر سے پورا کیا۔

طلبا کے ایک حقیقی آرگن کی حیثیت سے اس نے فرائض نیابت کو بطریق احسن انجام دیا، ان کے جائز مطالبات کو خواہ تعلیمی مسئلہ میں تھے یا کسی دوسرے شعبہ سے متعلق ہوتے، جوہر نے پرزور طریقے پر تائید کی۔ ان کی شکایات کو مناسب ترین لہجہ میں اراکین جامعہ کے سامنے پیش کیا۔ خود طلبا کی اصلاح و تربیت کا حق اس نے کماحقہ ادا کیا۔ ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان کا سیاسی مطلع تیرہ و تار تھا، وہ طلبا اور دیگر ناظرین کے سامنے شمع راہ بنکر نکلا۔ اُس نے وقتاً فوقتاً جامعہ کی اکثر خامیوں پر نوٹس لیا اور اس میں شبہ نہیں کہ

ل یہ نمبر کتبخانہ ملیہ اسلامیہ میں محفوظ ہیں۔

سابق شیخ الجامعہ صاحب نے اسکے ہر صلاح و مشورہ کو بہ نظر قدر دیکھا،
اس کی ہر جائز شکایت کو رفع کیا؛ اس کی زندگی کا سب سے نمایاں کارنامہ
ایک یہ ہے کہ اس نے جامعہ کے پچھلے امتحانات کے نتائج سب سے پہلے شائع
کیے اور یہی نہیں بلکہ اس کی متعدد کاپیاں چھاپکر ملحقہ مدارس کے ہیڈ ماسٹران
کو (جوان دنوں یہاں ایک جلسہ میں آئے ہوئے تھے) مہیّا کیے۔

غرض جوہر نے اس خیر و خوبی کیساتھ گذشتہ سیشن پورا کیا اور سال کے اختتام
پر جبکہ گرمیوں کی تعطیل ہو رہی تھی مجلس جوہر نے جولائی میں غیر معمولی سالانہ
نمبر نکالنے کا اعلان کیا طلبار میں مضمون نویسی کا مذاق سلیم پیدا کرنیکی غرض سے ایک
"قیمتی انعام" بھی شائع کیا نیز ادرصحاب سے نج کے طور پر ملکر مضامین بھیجنے کا وعدہ
لیا لیکن ان سب کے باوجود بہت کم مضامین پہونچے اور اس وعدہ خلافی کی توقع
ہمیں پہلے سے تھی۔ بہرحال جوہر کا مقصد چونکہ طلبار میں علمی معلومات پیدا کرنا بھی
ہے اس لئے اس پرچہ میں باہر کے مضامین اور نظمیں اکثر نظر آئیں گی۔

ہمارے پرچہ کا نظام بالکل جمہوری اصول پر ہے۔ چار ممبران کی ایک کمیٹی
ہے جو مجلس جوہر کے نام سے موسوم ہے۔ ہمارے اکثر احباب نے اس کو اصول جرنلزم
کے خلاف سمجھا اور یہ مشورہ دیا کہ کسی ایک شخص کا نام ہونا چاہئے لیکن ہم نے اپنے
پرچہ کو شخصی اثرات سے ہمیشہ دور رکھا ہاں جب کبھی کسی امر کی جوابدہی کرنی
ہوتی تو قاعدہ کے مطابق اپنے میں سے کسی ایک کو عارضی منتخب کر لیتے۔

دنیا کی اس سے بڑی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ذریعہ حصول مقصد کو خود مقصد قرار دے لے۔ بت اور صنم معرفت الٰہی کے وسیلے تھے لیکن خود معبود بنائے گئے، آفتاب و ماہتاب خدا کی عظمت و جلال کے مظاہر تھے لیکن خود ہی قبلۂ حاجات ہو گئے۔ غرض آج صدہا مثالیں اس قسم کی مل سکتی ہیں۔ اسی طرح امتحان بھی جو علمیت و لیاقت کے انداز کا ذریعہ تھا آج خود ایک مستقل مقصد سمجھا جانے لگا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس طریقہ کے موجد اول نے اسے فوجی قابلیت کا ایک معیار سمجھ کر اپنی فوج میں رائج کیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ طریقہ تعلیمی شعبہ میں آگیا۔ اور اسی حد تک مفید اور بہتر تھا جب تک یہ علمی قابلیت کا معیار تھا لیکن آج مغرب سے لیکر مشرق تک تمام درسگاہیں اس مرض میں مبتلا نظر آتی ہیں کہ اس ذریعۂ حصول مقصد کو مقصد قرار دے رکھا ہے۔

ہندوستان کا موجودہ نظام تعلیم جس طرح بہ لحاظ وطنیت و قومیت مضر اور بے سود ثابت ہوا ہے اسی طرح علمی قابلیت کے لحاظ سے بھی کچھ مفید اور کارآمد نہ نکلا جس کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ آج ہماری قومی تعلیم گاہیں بھی اس مرض مزمن کے اثر سے بچتی نظر نہیں آتی ہیں۔

اساتذہ و تلامذہ ہر دو جانب سے امتحان کی اس قدر اہمیت دی جارہی ہے کہ مقصد حقیقی کے فوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اساتذہ کی جانب سے بڑے ساز و سامان کے ساتھ اس کی تیاریاں ہوتی ہیں، طلبا بھی یہ دیکھ کر اس سالانہ تہوار کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ علمی مسائل کی تحقیق و تدقیق میں کوشش کریں۔ کتابوں کے خط کشیدہ فقرے اور ابواب کی سرخیاں رٹ لینے پر اکتفا کرتے ہیں

(۳) ترک و عرب

اتحادیوں نے ترکوں کے سامنے جو شرائط صلح پیش کی ہیں ان میں صرف ترکی صوبوں کو شامل کیا ہے باقی عرب کے حصے مثلاً شام فلسطین، حجاز اور عراق کا مسئلہ یونہی چھوڑ دیا ہے لیکن ان شرائط سے قبل ابھی ترکوں نے عارضی صلح کی بشرط پیش کی ہے۔ کہ یونان اناطولیہ کو خالی کر دے بالفرض اس کے پورا ہونے پر اگر ترک اتحادیوں کے ان شرائط پر راضی ہو گئے اور عربوں کا مسئلہ ویسا ہی چھوڑ دیا تو اس پر ہندوستان کے مسلمان سخت برہم ہیں اور ترکوں سے اپنے قدیم اتحاد و دوستی کو بھی توڑنے پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں مسلمان ہند کی ناراضی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ان حالات سے قطعی ناواقف ہیں جو ترکوں کے ساتھ دس برس سے پیہم پیش آرہے ہیں اور اگر ان کو اسکی واقفیت ہے تو انہیں اس درد و تکلیف کا احساس نہیں جو ترکان احرار اس ث میں سہتے چلے آتے ہیں ان شرائط کے لحاظ سے اگر خلافت عثمانیہ بحال ہو جاتی ہے ترکی صوبے واپس ملجاتے ہیں اور صرف عربوں کا معاملہ رہجاتا ہے تو ہمارے خیال میں ترکوں کا ان شرائط پر راضی ہو جانا مناسب ہے اور پھر اس کے بعد وہ عربوں کا معاملہ طے کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں ورنہ اس صورت میں ان کا دو نو مسائل ایک ساتھ طے کرانا بہت دشوار ہے۔ ہندوستان کے مسلمان آرام سے کھانے کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتے ہیں وہ کیا سمجھیں کہ ترک ۱۹۱۲ء سے کن حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ اور ان کو امن و امان کی کیسی آرزو ہوگی ہمیں کیا! ترک موالات جیسی پر امن جنگ دس سال کیا سیکڑوں برس جاری رکھی جاسکتی ہے۔

رہا عربوں کا مسئلہ، اگر ترک اپنے مطالبات میں اسے بھی شامل کر لیں تو جبتک خود عرب اپنی آزادی کے لیئے کوشاں نہ ہوں ترکوں کی کوششیں کہاں تک بار آور ہو سکتی ہیں پھر تو وہی مثل صادق آتی ہے مدعی سست گواہ چست۔

مسلمانان ہند کے لیئے سب سے مناسب یہ ہی کہ وہ غازی مصطفٰے کمال پاشا پر کامل اعتماد رکھیں اور انھیں خود ان کے حالات کی بنا پر ان شرائط کو قبول کر لینے دیں باقی رہا ہندوستان کا ایجیٹیشن، اس کے لیئے مسلمانوں کو چاہیے کہ ترک معہ عربیہ دونو مسائل اپنے مطالبات میں قائم رکھیں اور اسوقت تک چین نہ لیں جب تک کہ جزیرۃ العرب کا مسئلہ شریعت کے مطابق طے نہ ہو جائے۔
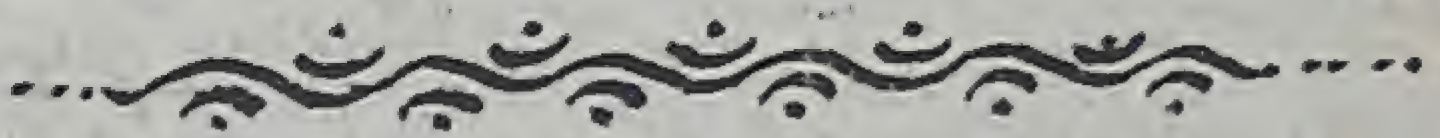
(۴) پارسیوں کی مراجعتِ وطن

آجکل ہندوستان کی سیاست میں پارسیوں کی مراجعت وطن کا ایک جدید مسئلہ گھر کر رہا ہے اس تحریک کے بانی مسٹر منوچہر وادی ایک پارسی سیاح ہیں جو آجکل ایران کا دورہ صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ دیکھیں ایران میں پارسیوں کے لیے گنجایش باقی ہے؟ انھوں نے حال میں ایک خط شایع کیا ہے جس میں ہندوستان کے پارسیون کو ایران آنے کی ترغیب دی ہے انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ ان کے لیے نہ صرف ایرانی حکومت ہر طرح کی مراعات بہم پہونچائیگی بلکہ ایران کے امراء ورؤساء (خواہ مسلمان ہوں یا پارسی وزردشتی ابھی ان کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں۔

ہندوستان میں پارسیوں کی تعداد اگرچہ ایک لاکھ سے زائد نہیں لیکن انھوں نے اپنی دماغی ومالی قابلیت کی وجہ سے ہندوستانی قومیت میں جو پوزیشن حاصل کر لی ہو وہ یقیناً ان کے لیئے اور ایران کے لیئے باعثِ صد نازہے۔ ٹاٹا بنک اور اسی نام سے شیشے، لوہے اور کپڑے کے متعدد کارخانے ہندوستان کے مختلف حصون میں ایک پارسی (جمشید جی ٹاٹا) ہی کی یادگار ہیں۔آج بھی یہاں کی بڑی بڑی تجارتیں ان کے ہاتھوں میں ہیں یہ مسئلہ جس قدر ایران کے لیئے اہم ہے اس سے زیادہ مسلمانانِ ہند کے لیئے قابل غور ہے ایک طرف بحیثیت مسلمان ان کے ایران چلے جانے سے ایک اسلامی حکومت کی خوشحالی اور فارغ البالی کا خوش آیند خیال آتا ہے تو دوسری طرف ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے ہندوستانی قومیت سے ایک ناقابل تلافی عنصر نکل جانے کا صدمہ پیش نظر ہے۔

ہم مسٹر موصوف کے اس پاک جذبۂ وطنیت و احساس قومیت کا احترام کرتے ہیں اور بہ ادب یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا امریکہ کے دولتمند یہودی تاجر اپنی بڑھتی دولت چھوڑ کر آج فلسطین کی پتھریلی گھاٹیوں میں آنیکو تیار ہیں؟ جو اِن کا آبائی وطن ہے ہمیں اپنی جگہ پر کافی اطمینان ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں اس قدر دلاویزی اب بھی باقی ہے کہ ہمارے پارسی بھائی اس خاک ہند کے چھوڑنے پر مائل نہ ہوں گے پارسیوں کو یہاں آئے ہوئے صدیاں گذر گئیں موجودہ نسل اسی خاک سے پیدا ہوئی پھر کیا اسے بیوفائی کی توقع ہوگی؟ ہاں اگر اس تحریک کے بانی کا مقصد ایران کی تجارت وصنعت کا بڑھانا ہے تو ہم انکو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ یورپینوں اور ان کے سرمایہ کی بجائے ان سے کام لیں اور اِدھر پارسی حضرات سے یہ گذارش کریں گے کہ قدیم تعلقات کی بنا پر جو انھیں ایران سے ہیں وہ اپنی دولت اس ملک کی تجارت اور کانوں اور ریل وغیرہ کے ٹھیکوں میں لگائیں اور اس طرح وہاں کی تجارت وصنعت کو فروغ دیکر اپنا ایک قدیم ملکی فرض ادا کریں گے۔

---

(۵)

یادش بخیر مولینا محمد علی صاحب کے تازہ حالات مستغرق طور پر کچھ معلوم ہوئے ہیں بے اختیار جی چاہا کہ ان کا تذکرہ کریں لیکن وہ الفاظ کہاں سے لائیں جو انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکیں۔ لیکن بہرحال لکھنا کچھ ضرور ہے۔

حیات صاحب اور بمبئی کرانیکل کے نمایندہ کی گفتگو سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولینائے محترم آجکل دو بڑی کتابیں، لائف آف محمد۔ اور کامن ولتھ آف اسلام لکھ رہے ہیں ناظرین کو یاد ہوگا کہ ینگ انڈیا کے ایک پرچہ میں (مئی ۱۹۲۲ء) ایک خط سٹرایڈریوز کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں مولینا نے انجیل کے متعلق استصواب رائے کیا تھا۔ اور بعض کتابوں کے نام بھی دریافت کئے تھے۔ ان دونو واقعات کے یکجا کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مولینا اسلام اور مسیحیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگیوں کا بالمقابل مطالعہ (کمپیریٹیو اسٹڈی) کر رہے ہیں اور پھر اس کے بعد جو تصنیف تیار ہوگی وہ نہ صرف لٹریچر کا بیش بہا اضافہ ہوگا بلکہ مسلمانان عالم کے لئے سرمایۂ ناز ہوگا یہ کہنا ہی بے سود ہے کہ ہم ان تصانیف کے دیکھنے کے مشتاق ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس محبوب کی ہر جنبش و حرکت دیکھنے کیلئے ہماری چشم انتظار وا ہے۔

---

(۶) جامعہ کا ارگن

ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو اپنی ایکسال کی تحریر کا اگر جائزہ لیں تو دسطرایں فی یوم بھی اوسطیں پڑی ہوں؟ یہ ایک سوال ہی جو اکثر ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہی لیکن اس کے جواب میں کوئی طالب علم ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں. شاید اس کا یہ سبب ہو کہ انھوں نے تحریر و مضمون نویسی کی اہمیت و ضرورت پر کبھی دس منٹ بھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا ہی۔ اگر یہ سچ ہی تو ہم ان سے ایک چھوٹا سا تاریخی واقعہ بیان کریں گے اور وہ یہ کہ سید جمال الدین افغانی جو اتحاد اسلامی کے سب سے پہلے اور بڑے بانی ہیں، جب ممالک اسلامی کی آزادی اور باہمی اتحاد کی سرفروشانہ کوششیں کر رہے تھے تو انھیں مصر میں ان مقاصد کی راہ میں جو سب سے بڑی کمی محسوس ہوئی وہ اہل قلم کا فقدان تھا چنانچہ وہ جامعہ ازہر گئے اور طلباء میں سے ایک خاص جماعت اہل قلم کی پیدا کی جو آگے چلکر مصر کی آزادی بلکہ دنیاے اسلام کے مفاد کا ذریعہ بنی" ان میں سے ایک مفتی محمد عبدہ کی ذات تھی جن کی نسبت سید جمال الدین نے فخریہ یہ الفاظ ارشاد کیے "میں نے ایک ایسا شخص پیدا کیا جو قیمت میں برطانیہ کے ڈریڈ ناٹ سے کہیں بڑھکر ہی" کون کہہ سکتا ہی کہ مفتی عبدہ کی شمشیر قلم برطانیہ کی تیغ و تفنگ سے کمتر ثابت ہوئی۔

یا شاید اس بے توجہی کی یہ وجہ ہو کہ ان کو تحریر و مضمون نویسی کی مشق کا موقع نہ ملتا ہو، کسی باہر کے پرچہ میں کچھ لکھتے ہوئے ہچکچاہٹ سی پیدا ہوتی ہو۔ ہمارے خیال میں دونوں اسباب صحیح ہیں اور موخرالذکر وجہ اول الذکر کی ذمہ دار ہے

اس بناپر ہم شیخ الجامعہ صاحب کی خدمت میں یہ تجویز پیش کریں گے کہ اس اہم ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جامعہ سے ایک رسالہ نکالا جائے، ہم نے پچھلے نمبر میں بھی اس پر ایک نوٹ لکھا اور پھر دوبارہ طلباء اور جامعہ کی توجہ اس طرف مبذول کرانی چاہتے ہیں۔

شیخ الجامعہ

جولائی ۱۹۲۲ء کے دوسرے ہفتہ میں شیخ الجامعہ صاحب نے طلبا ر کے سامنے اپنی پہلی تقریر ہوئی تھی آپنے اُسمیں فرمایا تھا کہ "طلبا ر کو عملی سیاسیات سے علحدہ رہنا چاہیئے" اس میں شبہہ نہیں کہ علمی انہماک و محویت کے ساتھ ساتھ سیاسی شور وشغب کبھی نہیں چل سکتا علاوہ اس کے خود علمی مشاغل اس قدر وسیع ہیں کہ سیاسی مصروفیت اس کے لیئے مضر ہوگی لیکن کیا ہم بہ ادب جناب کی خدمت میں یہ گذارش کر سکتے ہیں کہ جامعہ کے مشاغل خود اس قدر گوناگوں اور متعدد ہیں کہ خلافت یا کانگریس کی ذمہ داری لینی جامعہ کے مفاد کے منافی ہی اور خود کثرت کار سے خدانخواستہ صحت پر کوئی اثر پڑنے کا اندیشہ بھی ہی۔

(۹)

ہمیں یہ سنکر کمال افسوس ہوا کہ سلک گوہر سے ایک بیش بہا موتی نکل گیا یعنی اسٹاف سے ہمارے مکرم جناب ذاکر حسین صاحب علحدہ ہو رہے ہیں اور بغرض تعلیم معاشیات جرمنی جارہے ہیں یوں تو عام طور پر ہر شخص کو تیکن بالخصوص ہمکو سب سے زیادہ افسوس ہی کہ قدردانان جوہر کی فہرست میں سے ہیرے کا نام نکل گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ تحصیل علم کا پاک مقصد لیکر جارہے ہیں تو ہمارے دل میں مسرت وخوشی کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہی اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ؎

بسفر رفتنت مبارک باد
بسلامت روی و باز آئی

عید ڈنر

عید اگر ایک طرف پیام مسرت لیکر آئی تو دوسری جانب ریوٹر کی برقیات نے "یونانیوں کی قسطنطنیہ پر پیشقدمی" کی جانکاہ اور روح فرسا خبر سنائی۔ شادی و غم، مسرت و رنج اطمینان و پریشانی کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چمنستان دہر میں جہاں پھول ہیں، وہیں کانٹے بھی۔ کچھ تعجب نہیں اگر اس عید میں بھی ماتم سے فرصت نہیں۔ زمانہ شاہد ہے کہ ہماری کتنی عیدیں محرم سے بدل گئیں۔ مسلم قوم مصائبِ والام کی کچھ ایسی عادی ہو گئی ہے کہ ہر مصیبت کا صبر و خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتی ہے۔

اس موقع پر ہمارے طلبائے جامعہ نے اس انداز سے عید منائی کہ گویا یہ ان کی پہلی اور آخری عید تھی۔ دوگانے ادا کئے، ایک دوسرے سے گلے ملے۔ غرض سارا دن خوش خوش گزارا۔ یہیں تک بس نہیں ؟ بلکہ شب میں ایک نہایت پر تکلف ڈنر ہوا جس میں اساتذہ بھی مدعو تھے۔

لیکن باوجود اس کے بعض طبیعتیں ایسی درد مند واقع ہوئی تھیں جنھوں نے اُس مصیبت کو محسوس کیا جو اس جانکاہ خبر سے دُنیائے اسلام پر آنے والی تھی۔ اسی بنا پر جناب شیخ الجامعہ صاحب نے ہماری اس عیدی دعوت کی شرکت سے صاف انکار کر دیا اور اس انکار کا سبب ایک سبق آموز، محبت افزا اردو انگریز خط کے ذریعہ ظاہر کیا جو دعوت کے بعد پڑھا گیا اور وہ یہ ہے:-

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے محترم رفقا اور میرے عزیز طلبا!

السلام علیکم رحمۃ اللہ برکاتہ۔ میں آپ کے اس وقت کی محبتانہ صحبت میں شریک نہ ہونے پر اپنے دلی رنج کا اظہار کر کر آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ آج کی دعوت کے میزبانوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں بہت سے کشمکش و رنج میں تھا کہ میں اس وقت عدم شرکت کی وجہ لکھوں یا نہیں

بالآخر میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس خط کے ذریعہ اس وجہ کو ظاہر کر دوں اور یہ خط کھانے کے بعد اس صحبت میں سنا دیا جائے تاکہ آپ کے کھانے کے لطف میں خلل انداز نہ ہو۔

آج بعد نماز عید الضحیٰ جب میں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہم مسلمان اسلام کی فتح کی دعا مانگنے کا منہ نہیں رکھتے ہیں میں نے تھوڑی دیر پہلے کچھ بیان کر کر جھولی لے کر مولانا محمد علی شاہ صاحب کے ساتھ پھرنا شروع کیا تھا اور میں مسلمانوں کی حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کڑھ رہا تھا۔ موالات اور غیر موالات تو دوسرا سوال ہے لیکن اسلام پر انتہائی مصائب کی داستان بھی ہمارے دلوں پر جب کوئی اثر نہیں کرتی تو ہمارے لیے مٹ جانے کے سوا اب کیا باقی رہا ہے۔ تین تین سو کے نوکر سرکاری میری مدد کو بھی ایک جزو عطیہ بنا کر ایک آنہ دو پیسہ دیتے تھے ہر شخص خوش اور مسرور نظر آتا تھا۔ دعا کے وقت میرے دل میں اس حالت کے برداشت کی تاب نہ رہی اور میں اس وقت سے یہ تہیہ کر بیٹھا ہوں کہ عیدوں کی کسی تقریب میں شریک نہ ہوں گا۔ اس وجہ سے شہر کی دعوتوں سے بھی انکار کر رہا ہوں۔ میں اس وجہ سے کسی سے عید بھی نہیں ملا آپ کھانا کھا چکے ہیں، آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ لیکن آئندہ کے لیے سوچیں کہ ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ کے بنیادی خیالات اور اس کے اصلی بانی مولانا محمد علی کے خیالات اور موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے متعدد قسم کے پر لطف کھانے علی الاعلان اس طرح کھا سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے تو پلاؤ بریانی وغیرہ کو جامعہ کے لیے بند کر دیا تھا اور آج بھی میں کلیۃً بند کر سکتا ہوں۔ مگر میرے مغموم دل نے یہ سوچا کہ میں آپ کی عید کو کیوں خراب کروں میں اپنے وطن میں ہوں۔ آپ اپنے اعزہ اور اقربا سے دور یہاں ہیں، آپ کو کہیں یہ خیال نہ ہو کہ جامعہ میں اس وقت نہ ہوتے، گھر ہوتے تو یہ ہوتا اور وہ ہوتا اس لیے میں خاموش رہا۔ اب عید ختم ہو گئی۔ اس لیے میں آپ سے نہایت خلوص و محبت کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ پر غور کریں اور آئندہ کے لیے

ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو آپ کے، آپ کے جامعہ اور اس کے بانی اور بانیوں کے شایان شان اور مناسب حال ہو۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا دردمند دل میرے دل کی حالت کو محسوس کرے گا خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کو اسلام کی حقیقی خدمت کا ذریعہ بنائے۔

آپ کا بہی خواہ

(دستخط) خاکسار عبدالمجید خواجہ عفی عنہ

تشبیب قصیدۂ نعتیہ

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی
رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاکِ گریبانی

وہی سمجھیں گے جو واقف ہیں اسرارِ محبت سے
کہ یکساں جانگسل ہے ذوقِ وصل و دردِ ہجرانی

ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشتِ ایمن کا
قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی

اُدھر دوشیزہ کرنوں کا نکلنا سمتِ مشرق سے
اِدھر بزمِ جہاں سے رخصتِ بزمِ شبستانی

اُدھر صبحِ گریباں چاک کا راہِ عدم لینا
اِدھر خورشیدِ عالمتاب کا آغاز رخشانی

صبا کے گدگدانے سے اُدھر کلیوں کا ہنس دینا
اِدھر شبنم سے پھولوں کی عرق آلودہ پیشانی

اُدھر پھولوں کی جھرمٹ میں شعاعوں کی نظربازی
اِدھر خود جلوۂ خور سے گلوں کی چاک دامانی

اُدھر سبزہ کا جاگ اٹھنا خمارِ خوابِ نوشین سے
اِدھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی

اُدھر شبنم کی ہستی کا فنا فی النور ہو جانا
اِدھر گل کا صبا سے ادعائے پاک دامانی

اُدھر دوشِ صبا پر رقص کرنا نکہتِ گل کا
اِدھر صحنِ چمن میں بلبلوں کی زمزمہ خوانی

اُدھر رندانِ بیکش کا صبوحی کے لئے اٹھنا
اِدھر اشراق پڑھ کر زاہدوں کی سبحہ گردانی

اُدھر شاخِ گل ساغر بکف ہے صحنِ گلشن میں
اِدھر محوِ اقامت ہے قطارِ سروِ بستانی

بجا ہے صبحدم گر چشمِ نرگس ہے خمار آگیں
چمن میں رات بھر کی ہے زرِ گل کی نگہبانی

کسی کے خندۂ دنداں نما کا کھنچ گیا نقشہ
لبِ گلبرگ پر شبنم نے جب کی گوہر افشانی

چمن پیرا ترے قرباں تری نیرنگ سازی کے
لبِ ہر غنچہ پہ ہے گل پوھر ہو رفی عشانی

وہ تابستاں کے بعد ابرِ سیہ کا جوشِ تردستی
وہ آغازِ بہاراں اور رخصت فصلِ زمستانی

بہار آئی ہوئی آراستہ پھر بزمِ امکانی
ہوا گلزار عالم پھر جوابِ باغِ رضوانی

چمن کا جلوۂ رنگیں ہے یا اک شعرِ فطرت ہے
کہ جس پر ذوقِ فطرت خود ہی محوِ آفریں خوانی

کمالِ عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلوے پر
مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدادانی

خود اپنی شکل دیکھی پردۂ برقِ تجلی میں
تعجب کیا ہوئی گر دیدۂ موسیٰ کو حیرانی

کہاں کا دشت ایمن طور کیا برق تجلی کیا!
یہ سب کچھ تھے جمالِ مصطفےٰ کی پرتو افشانی

محمد علی

نمونہ قیامت کا تھا دورِ حاضر
سراسر تھے آثارِ فترت کے ظاہر
عمل اپنا کرنے سے فطرت تھی قاصر
نمایاں تھیں مایوسیاں اول آخر
لرزتا تھا باطل کے حملوں سے ایماں
سبق کفر کا پڑھ رہے تھے مسلماں

غضب ظلمت ظلم تھی سایہ افگن
شبِ تار یکسر بنا روزِ روشن
لگے رہبری کرنے آ آ کے رہزن
بنے دوست اکدم سے خونخوار دشمن
جہالت کے مکتب میں داخل ہوئے سب
بہائم کے شاگرد، عاقل ہوئے سب

غضب تھا وہ غیروں کا شاگرد ہونا
یہ تھا کفر و الحاد کا بیج بونا
یہ تھا عزت و آبرو کا ڈبونا
یہ تھا دولتِ دین و ملت کا کھونا
یہ تحصیل تھی اس کی اور یہ تمامی
کہ پڑھ لکھ کے حاصل ہو داغِ غلامی

وہ تعلیم کی جس نے سب میں سرایت
وہ تعلیم، ہوتی تھی جس کی حمایت
وہ تعلیم، تھی دور جس سے درایت
وہ تعلیم، تھی نوکری جس کی غایت
وہ کفر و ضلالت خدا کی قسم تھی
وہ سم تھی وہ سم تھی وہ سم تھی وہ سم تھی

رہا جب نہ لوگوں کو احساس باقی
نہ کچھ دین و اسلام کا پاس باقی
دغا و ستم کا نہ وسواس باقی
وفا کی رہی جھوٹی اک آس باقی

تو ان رہبروں نے بڑا زہر اگلا
زمانہ ہوا محو حیرت کہ یہ کیا؟
وہیں غیرت حق نے بس جوش مارا
ندا کی کہ ہے کوئی بندہ ہمارا
کرے حق کو جو بے خطر آشکارا
محمد علی نے یہ فوراً پکارا
کہ حاضر ہوں اے میرے ذیشان مولا
ترے نام پر جان قربان مولا
مٹادوں گا باطل کو تیرے کرم سے
زباں سے، قلم سے، قدم سے، درم سے
چھڑادوں گا بندوں کو جور و ستم سے
گزر جاؤں گا اپنی جان اپنے دم سے
یہ چھاتی کا پتھر ہٹا کر رہوں گا
ضلالت کی ظلمت مٹا کر مٹوں گا
زمیں کو کیا نور حق سے منور
رہے دیکھنے والے حیران و ششدر
بڑھایا قدم کہہ کے اللہ اکبر
لیا ساتھ اللہ والوں کا لشکر
برستی ہوئی جن کے چہروں پہ رحمت
عیاں پر نمایاں نشانِ خلافت
خلافت کا صبح و مسا راگ گایا
خلافت کا ہر سمت ڈنکا بجایا
دلوں پر خلافت کا سکہ بٹھایا
خلافت کا جس وقت جھنڈا اٹھایا
سراپائے فتح و ظفر بن کے نکلے
دعا بن کے نکلے، اثر بن کے نکلے
عدو آفتیں ان پہ برسا رہے ہیں
یہ چپ چاپ اپنے چلے جا رہے ہیں
وہ ظلم ان پہ کر کرکے اترا رہے ہیں
انھیں ظلم میں اور لطف آ رہے ہیں
حریفوں کے جتنے ستم بڑھ رہے ہیں

بس اتنے ہی ان کے قدم بڑھ رہے ہیں

صداقت نے وہ رنگ اپنا دکھایا کہ عالم کو تصویر حسرت بنایا
قدم شوکتِ حق نے ایسا جمایا کہ باطل کے لشکر کو کوسوں ہٹایا

بس اب سب کے سب متصل بڑھ رہے ہیں
خدا کی عنایت سے دل بڑھ رہے ہیں

درسِ عمل

جوشِ عمل سے کام لے عرصۂ روزگار میں
دل کو رہین غم نہ کر رحم کے انتظار میں

ننگ ہے شکوۂ جفا، شیوۂ ضبطِ نفس سیکھ
چھوڑ کے جا گلِ وفا دامنِ روزگار میں

چھوڑ بھی لطفِ زندگی، حبِّ وطن سے مست ہو
دیکھ تو کیا سرور ہے اس مئے خوشگوار میں

نذرِ رہِ نیاز کر، ہے یہی شرطِ بندگی
خون کی ایک بوند بھی ہے جو دلِ فگار میں

ہیں جو یہ چند ہستیاں، محوِ نمائشِ ستم
ان کی شکست بھی ہے درج صفحۂ روزگار میں

پھر وہی جوشِ دل دکھا ہے جو سلف کی یادگار
چاہتا ہے اگر فروغ دیدۂ اعتبار میں

کر کے تباہ یوں مجھے خوش نہ ہو اے ستم پرست
شعلۂ قہر کردگار ہے ترے انتظار میں

حبِّ وطن کے ولولے قید میں دبتے ہیں کہیں
جسم ہو دل نہیں مگر آپ کے اختیار میں

دشمنِ جانِ حریت، میرے سکوت پر نہ جا
اب بھی دبے ہیں کچھ شرار سینۂ داغدار میں

میری فنا میں ہے بقا تو بھی مٹا کے دیکھ لے
حوصلہ کیوں رہے ترے قلبِ ستم شعار میں

محویؔ و شاعرانِ عصر ہوش میں آئے اب تو کیا
عمر تو سب گزر گئی ذکرِ گل و بہار میں

مادرِ ہند و برطانیہ

اٹھا کر بستره چلتے نہیں عُمّالِ برطانی
بہت مدت رہے، اب ہند میں رہنا ہی نادانی
جو رہنا ہی یہاں ہے، رہیے رعیت کے طریقہ سے
عطا فرمائیں گے تم کو مراعاتِ فراوانی
تجارت کیجیے، یا نوکری یا صنعت و حرفت
کریں گے آپ کی ہر طرح ہم امداد و نگرانی
یہاں کا بچہ بچہ اپنی آزادی کا خواہاں ہے
خیالِ سلطنت سے اب اُٹھاؤ گے پشیمانی
بہادر ہیں، جری ہیں پوت میرے ہندو و مسلم
کریں گے اپنے گھر کی آپ ہی اب خود نگہبانی
ہیں لختِ دل گرو دستہ پَو ستیا پال اور گاندھی
عَلیؔ و جوہر و انصاری و آزاد سبحانی
سلیمؔان ندوی و شاہِ سلیمان فاخر و ماجد
حسینؔ و مظہر الحقؔ، عبد باری اور موہانی

چاند سے

اے خوبرو شناور دریائے بیکراں کے
اس دہر کے شبستاں کا اک چراغ ہی تو
چشمِ جہاں کی ٹھنڈک اے ماہتاب ہی تو
لہرا رہا ہی تجھ میں اک نور کا سمندر
تیری ضیا کی بارش ہی مزرعِ جہاں پر
ہی جلوہ ریز تیرا نورِ جمال کیا کیا!
ساقی ہی تیری مے کا اک تشنہ کام اِدھر بھی

اے دائمی مسافر صحرائے آسماں کے
یا محفلِ فلک کا سیمیں ایاغ ہے تو
بس مہر گرم خو کا پورا جواب ہے تو
محفل میں چل رہا ہی تیرے کرم کا ساغر
جوبن برس رہا ہی کیا خاکِ گلستاں پر!
ہر ذرہ باغِ عالم کا ہی نہال کیا کیا!
صدقے ترے کرم کے۔ ہاں ایک جام اِدھر بھی

رہتا ہی اے جہاں گرد پاؤں میں تیرے چکّر
ہاں اے رفیقِ شب، اے بیتابیوں کے شاہد
اے چاند تو نے دیکھا ہی نیند کا اُچٹنا
دیکھا ہی تو نے راتوں کو سرد آہیں بھرنا
اُس ماہرو سے اپنی اللہ رے بُعدِ منزل
کیونکر اُسے دکھاؤں سوزِ غمِ نہانی
ہی کون اپنا غمخوار اس حصۂ جہاں میں
تو چشمِ دوربیں سے عالم کو دیکھتا ہی
وہ ماہ ہو نہ مائل تیری طرف، سبب کیا؟
منہ دیکھتے ہیں دونوں اک آئینے میں گویا

ہوتا ہی تیرا پھیرا ہر ایک بحر و بر پر
اے چاند تو ہی بن جا پیغامِ دل کا قاصد
دیکھا ہی تو نے میری آنکھوں میں رات کٹنا
دیکھا ہی تو نے میرا مر مر کے صبح کرنا
آہوں کی بھی رسائی اُس تک ہی سخت مشکل
کیونکر اُسے سناؤں دکھ درد کی کہانی!
اک ذاتِ مشترک بس تو ہی ہی درمیاں میں
تو اُس کو دیکھتا ہی، تو ہم کو دیکھتا ہی
وہ دیکھتا ہو تجھ کو میری طرح۔ عجب کیا
ہی تیرے دم سے ہم میں شکلِ خطاب پیدا

اے جان تیرے لب پر ہر چند ہے خموشی
ظاہر ہے لیکن آنکھوں سے دل کی گرمجوشی
ضبطِ فغاں کی کوشش چہرے سے ہے ہویدا
بیتابیِ تکلم جنبش سے لب کی پیدا
چہرے پہ ہے جو تیرے چھائی ہوئی اُداسی
آتی ہے اس سے مجھ کو شکوے کی کچھ صدا سی
بس بس نہ دیکھ مجھ کو حسرت بھری نظر سے
بس بس نہ چھین میرا صبر اپنی چشمِ تر سے
آٹھوں پہر ہے گھڑیاں گننے سے کام مجھ کو
بے تیرے زندگی ہے حبسِ دوام مجھ کو
وہ پائے بندِ بندِ لیل و نہار ہوں میں
بے بس ہوں، مضطرب ہوں، بے اختیار ہوں میں
قسمت کی یاوری سے پھندا اگر یہ ٹوٹے
پھر دستِ آرزو سے دامن ترا نہ چھوٹے

اب تجھ سے دور ہرگز بخت آزما نہ ہوں گے
رہنا گواہ اے چاند پھر ہم جدا نہ ہوں گے

غزلیات

بداں منزل کہ سیدانی رسیدن آرزو دارم
شکستِ دشمنِ اسلام دیدن آرزو دارم

کہ تا برہم زنم بنیادِ ایں چرخ ستم آئیں
بیا اے ہم نفس آہے کشیدن آرزو دارم

جو می آید ز فیضِ یثرب و بطحیٰ پر و بالم
بہ سوئے اوجِ آزادی پریدن آرزو دارم

امان و مصطفیٰ کامل و قطبِ چرخِ اسلام اند
فلک آسا بہ پیش شاں خمیدن آرزو دارم

حریفاں جام ہائے کامرانی میخورند و من
فغاں یارب کہ زیں بادہ چشیدن آرزو دارم

خوشا بختِ من شیدا بمیرم چوں دریں صحرا
کہ میگوید کہ من اینجا رسیدن آرزو دارم

بلا سے بے نیاز گوش و لب ہی مدعا اپنا
وہ آنکھیں صاف سن لیتی ہیں حرفِ بے صدا اپنا

وہ چشمِ بادہ ریز اس کی یہ عشقِ پارسا اپنا
قیامت کی کشاکش میں ہے زہد و اتقا اپنا

نگاہ جلوہ سنج اپنی، دلِ درد آشنا اپنا
کسی کا کیوں کریں شکوہ ہمیں خود ہی گلا اپنا

نہ دوں کونین کے بدلے یہ گنجِ بے بہا اپنا
کہ مقصودِ دو عالم ہے دلِ بے مدعا اپنا

رہا ہوتے چلے تھے قیدِ ہستی سے خبر کیا تھی
کہ عمرِ جاوداں نکلا ہمیں ذوقِ فنا اپنا

محبت نام ہے اک عالمِ بے اختیاری کا
نہ عشقِ دلفروش اپنا نہ حسنِ دلربا اپنا

دیارِ حسن میں اللہ ری وارفتگی دل کی
انھیں سے پوچھتا ہوں بیخودی میں مدعا اپنا

بس اک پا لغزِ مستانہ میں طے کی منزل ہستی
کہ تھا فیضِ خمارِ چشمِ ساقی رہنما اپنا

بلا کی کشمکش ہے اس طرف برقِ تجلی ہے
وہ شوخِ سامری فن ہے اُدھر زہد آزما اپنا

جفائے ناز کے صدقے یہ احساں اسکا کیا کم ہے
اسی نے کر دیا مجھکو حقیقت آشنا اپنا

سوزِ دردِ دل سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو　　ہی دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
پھر ہو رہا ہی شور صلائے نبردِ عشق　　ہاں آئے وہاں نہ زخم جوابِ الاماں نہو
بازارِ جاں فروشی میں سودا نہو یہ کیا　　گاہک ملے تو جنس تو یہ بھی گراں نہ،
اس دردِ لاعلاج کی کیونکر دوا کروں　　وہ حالِ دل نہیں بھی تو مجھ سے بیاں نہو
کیا فائدہ گراں سے چھپایا بھی زخمِ دل　　یہ کام جب بنے کہ مژہ خونچکاں نہو
کیا کیجیے چکھے مائدۂ دل کو لختِ لخت　　تیرا ہی تیر سینہ میں جب میہماں نہو
خوفِ رقیب کا تو یہ عالم اور اسپہ عشق　ق　سب چاہتے ہیں چاہ کا ان پر گماں نہو
ہی وصلِ یار کی بھی تمنا کا حوصلہ　　ڈر یہ بھی ہی کہ طبعِ عدو پر گراں نہو
پہلوسے دل کو لیکے وہ کہتے ہیں یار سے　　کیا آسکے گھر میں آپ ہی جب میزباں نہو

سنتے ہی جس کے خلق میں کہرام مچ گیا
جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہو

ہم صدا دیکر ترے گھر پر چلے　　بینوا بھی کام اپنا کر چلے
چند لمحے بھی نہ ٹھہرے ہم یہاں　　آئے تھے جس گھر سے پھر اس گھر چلے
جب چلی بادِ بہار اور ابر آئے　　بادہ آئے بزم میں ساغر چلے
سجدہ ریزی کا جنوں جب سر چڑھا　　بے محابا ہوئے سنگِ در چلے
چاہیے ساقی شبِ مہتاب میں　　کم سے کم اتنی کہ ساغر بھر چلے
میکدہ میں شیخ کو دیکھا مگر　　ہم گیا اندر تو وہ باہر چلے

چھوڑ دا اس دنیا کو جو چاہے کرے
تم تو شیدا کام اپنا کر چلے

بزم مشاعرہ

ہمارے جامعہ میں ایک مجلس بزم مشاعرہ کے نام سے موسوم ہی جس میں طلبا گاہ گاہی اشعار کہتے ہیں جس کا اندازہ ذیل کی چند نمونوں سے بہتر ہو سکتا ہی۔

جوہر   جوہر

مصرع طرح :- لب پہ وعدہ دل میں صاف انکار ہے۔

وعدہ ہائے وصل پر تکرار ہے   لب پہ گہ اقرار و گہ انکار ہے

کہتی ہی ان کی ادائے مہر و قہر   دیکھ لو یہ تو رہی یہ نار ہے

اس رخِ نازک کو دیکھوں کس طرح   جس پہ اک تارِ نگہ بھی بار ہے

ہر قدم پر حشر برپا کر دیا   کس بلا کی شوخیِ رفتار ہے

آپ کے چہرہ سے ہوتا ہی عیاں   لب پہ وعدہ دل میں صاف انکار ہے

نیرؔ اس رخ کے تصور سے مدام
بزم دل اک مطلع انوار ہی

اللہ اللہ دیکھیے شیر دلی آج   لڑنے کو روباہ بھی تیار ہی

جس کو کچھ بھی پاس ہو اسلام کا   آئے یہ میدان یہ تلوار ہی

مصطفےؔ شان ید اللہی دکھا
سامنے وہ لشکر کفار ہی

خواب غفلت کا ہوا بس خاتمہ   شکر ہی اب ہند بھی بیدار ہی

لارڈ ریڈنگ کی یہ چالیں الاماں   لب پہ وعدہ دل میں صاف انکار ہی

یوں ہی گر کوشش رہی محمودؔ تو
جان لو کچھ دم میں بیڑا پار ہی